★★★★

MONTHLY AWAMI JAMHURIAT
LAHORE

ماہنامہ

عوامی جمہوریت

لاہور

جولائی 2011ء

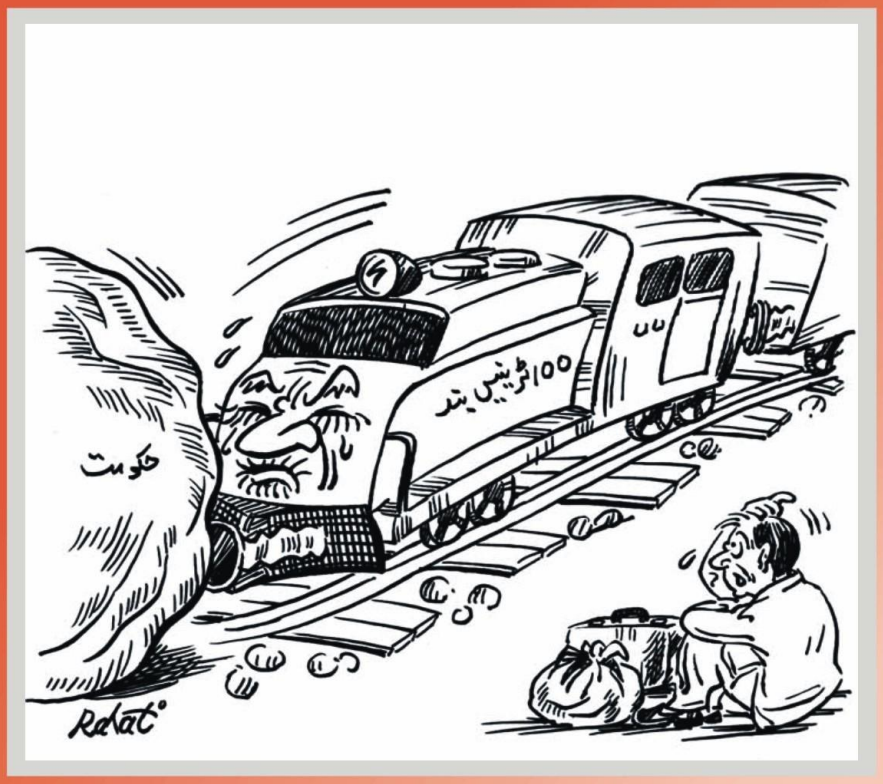

کرپٹ اور نااہل حکمرانوں کے ہاتھوں برباد ہوتے قومی ادارے

گیٹ شیڈ کونسل چیمبرز (یو کے) میں تقریب کی تصویری جھلکیاں

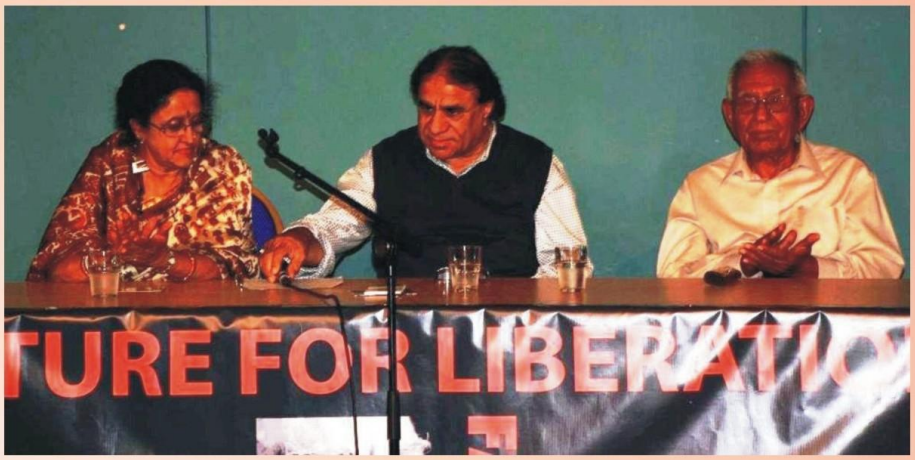

ورکرز پارٹی پاکستان کا ترجمان

CPL.NO. 279

شمارہ نمبر 4

جلد نمبر 8

جولائی 2011ء

قیمت 30 روپے

MONTHLY
AWAMI JAMHURIAT
LAHORE

ماھنامہ عوامی جمہوریت لاھور

اس شمارے میں

فہرست

اداریہ

حکومت اور حزب اختلاف، گرینڈ اتحاد کے نعرے 2

مقامی حکومتی نظام اور کمشنری نظام 3

مضامین

سرائیکی و ہزارہ صوبے کا مطالبہ — اختر حسین ایڈووکیٹ 4

مارکسی نظریہ داں۔ ڈاکٹر حسان — مسلم شمیم 7

انتخابی اصلاحات کی ضرورت — مقتدا منصور 12

فیض کے اسلوب کے استعماری عناصر — ڈاکٹر ضیاء الحسن 14

خبریں

کراچی میں متعدد شہریوں کے قتل کی ذمہ دار بڑی سیاسی پارٹیاں ہیں 17

خانیوال میں پارٹی اجلاس کی رپورٹ 17

نیوکاسل برطانیہ میں یوم مئی 18

یوم مئی 18

نیوکاسل میں فیض احمد فیض کی سوسالہ تقریبات 19

بریڈفورڈ میں فیض صدی کی تقریب — پروفیسر نذیر تبسم 19

آؤ کہ اہتمام ضیائے سحر کریں — غلام دستگیر محبوب 20

ایڈیٹر

نعیم شاکر

مجلس ادارت

عابد حسن منٹو

اختر حسین

مسلم شمیم

رابطہ آفس

5۔ میکلوڈ روڈ، لاہور پاکستان

فون: 042-37353309-37357091

فیکس: 94-42-36361531

Email:nshakir12@gmail.com

اکاؤنٹ نمبر: 01357900053903

حبیب بینک لمیٹڈ مال برانچ لاہور

سرکولیشن انچارج

نصیر ہمایوں

پبلشر محمد اسلم ملک نے لاہور آرٹ پریس انارکلی لاہور سے چھپوا کر 5۔ میکلوڈ روڈ، لاہور سے شائع کیا

حکومت اورحزب اختلاف، گرینڈ اتحاد کے نعرے

موجودہ حکومت ساڑھے تین سال پورے کرچکی ہے اور ملک کی معاشی، سیاسی اور انتظامی صورت حال پہلے سے بدتر ہے۔ ملک معاشی طور پر کنگال ہے۔ مہنگائی آسمانوں سے باتیں کررہی ہے، عام شہری کی زندگی اجیرن ہے، بجلی، گیس، تیل کا بحران ہے، صنعتی ارتقاء اور سرمایہ کاری مندی کی طرف ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ملک دہشت گردی، مذہبی انتہا پسندی، شدت پسندی کا شکار ہے اور قانون کی حکمرانی نہ ہونے کی وجہ سے بیرونی سرمایہ کار تمام تر ترغیبات کے باوجود سرمایہ لگانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ عوامی اہمیت کے تمام ادارے سٹیل مل، پی آئی اے، پی ٹی سی ایل، ریلوے، بجلی، گیس، تیل کے محکمے تباہی کی طرف جارہے ہیں۔ شہروں میں مافیہ کا قبضہ ہے، ہیروئین، ڈرگ، اسلحہ کی اسمگلنگ، زیر زمین معیشت اور کرپشن کا بے پناہ روپیہ ملک سے باہر جارہا ہے۔ بیروزگاری میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ ذرعی معیشت جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے ہاتھ میں ہے۔ ذرعی اجناس کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے ان کی دولت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے اوران کی دولت وآمدنی ٹیکس سے بھی مستثنٰی ہے۔ سالانہ بجٹ کا ابھی بھی بیشتر حصہ دفاعی وغیر پیداواری اخراجات کا ہے۔ اندرونی معاشی اور تمام تر بیرونی دباؤ کے باوجود ہماری دفاعی و خارجہ پالیسی کے امور پر فوج اور اس کی اسٹیبلشمنٹ کا غلبہ ہے۔ پارلیمنٹ کی بالادستی نہیں ہے۔ سامراجی ممالک خاص کر امریکہ سے دفاعی اور اور افغان پالیسی کے حوالے سے چند معاملات پر اختلافات کے باوجود حکمران امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے اور اسکی کو اپنی خارجی و معاشی پالیسیوں کا محور سمجھتے ہیں۔ حکمرانوں کی سماجی تبدیلی تو دور کی بات ہے عوامی اہمیت کے کسی بھی مسئلے کو حل کرنے کے بارے میں کوئی کمٹمنٹ ہی نہیں ہے۔ بس اپنی پانچ سال کی حکمرانی کو پورا کرنے کے لئے ہر قسم کے مفاد پرست گروہ اور افراد کو حکمران اتحاد میں جمع کر لیا گیا ہے، جن کو لوٹ گھسوٹ کے علاوہ کسی چیز سے غرض نہیں ہے۔

حزب اختلاف کی سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ (نواز) ہے جو دوستانہ حزب اختلاف اس لئے ہے کہ حکومت کی کسی بنیادی معاشی، دفاعی وخارجہ پالیسی سے انہوں نے بنیادی اختلاف کا اظہار نہیں کیا ہے۔ ملک میں بنیادی معاشی اصلاحات، صنعتی ارتقاء اور جمہوری اداروں کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ جاگیرداری باقیات اور بڑی زمینداریاں ہیں۔ جن کے خاتمہ کے لئے مسلم لیگ (ن) نے نہ تو اپنی پالیسی کا حصہ بنایا ہے اور نہ ہی کبھی اظہار کیا ہے۔ ملکی سالانہ بجٹ میں ٹیکس کی بنیادوں کو وسیع کرنے کے لئے معیشت دانوں کے مطالبے کے باوجود حکومت اور حزب اختلاف ذرعی آمدنی پر ٹیکس نہ لگانے پر متفق ہیں۔ ملک میں دہشت گردی، مذہبی انتہا پسندی پر بالکل خاموش ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شدت پسندوں اور مذہبی انتہاء پسندوں کے لئے ابھی بھی نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ خارجہ پالیسی کے حوالے سے بھارت کو دشمن نمبر ایک نہ ماننے اور تعلقات کو بہتر کرنے کے ایک دو بیانات کے بعد خاموشی اختیار کی ہوئی ہے۔ خارجہ پالیسی تزویراتی گہرائی، دفاعی پالیسیوں میں بنیادی تبدیلیاں لانے کے لئے عوامی رائے عامہ کو ہموار کرنے کی پالیسی اختیار نہیں کی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اختلافات محض حکمران (governance) کے طور طریقوں پر ہیں اور وہ آنے والے الیکشنوں کی تیار پر ہیں اور اس کے لئے کبھی کبھی گرینڈ الائنس کا نعرہ لگاتے ہیں۔ مگر ان کا یہ گرینڈ الائنس بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ دوسری نام نہاد حزب اختلاف کی جماعتیں یا تو حکومت پر دباؤ ڈال کر مفاد حاصل کرنے پر لگی رہتی ہیں جن میں جے یو آئی اور ایم کیو ایم شامل ہیں۔ عمران خان کی اچھل کود ہے یا پھر مذہبی بنیاد پرست وانتہا پسند ہیں جن کا اپنا ایجنڈا ہے جو ملک کو مزید تاریک گہرائیوں کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔

ہماری قوم پرست پارٹیاں خاص کر سندھ اور بلوچستان سے متعلق اپنے اپنے صوبوں سے نکل کر وسیع پیمانے کی سیاست کرنے کے لئے ابھی تیار نہیں ہیں۔ بلوچستان میں تو حکمرانوں اور اسٹیبلشمنٹ کی پالیسی کی وجہ سے انتہا پسندی اور علیحدگی پسندی کو عروج ملا ہے۔ ملکی پارلیمانی سیاست پر یقین رکھنے والے گروپ ابھی تک مخمصے کا شکار ہیں اور ان کی پارلیمانی سیاست کوئٹہ اور اسلام آباد کے ایوانوں تک ہے۔ سندھ کی قوم پرست پارٹیوں کا محورِ سیاست پی پی پی یا ایم کیو ایم کی مخالفت ہے۔ مرکز سے اپنے قومی حقوق اور صوبائی خوداختیاری کیسے حاصل ہوگی، تمام تر معاشی وسائل کس طرح سے صوبوں کے کنٹرول میں آئیں گے اور معاشی ترقی اور سماجی تبدیلی کیسے آئے گی اس کے لئے سیاسی نقطہ نظر میں تبدیلی اور طویل جدوجہد کی ضرورت ہے۔

اس انتہائی پیچیدہ سیاسی صورت حال میں حکمران طبقات کے ذاتی اور گروہی مفادات کے مقابلے میں ایک ایسی منظم سیاسی قوت کی ضرورت ہے جو ملک میں جاگیری باقیات اور بڑی زمینداریوں کا خاتمہ کرتے ہوئے ذرعی معیشت میں انقلاب برپا کرنے اور 60 فیصد دیہی آبادی کی زندگی بدلنے کا نظریہ وکمٹمنٹ رکھتی ہو۔ صنعتی ترقی سامراج سے معاشی آزادی چاہتی ہو۔ ایک ایسی حقیقی وفاقیت اور پارلیمانی جمہوریت جس میں وفاقی اکائیاں خودمختار اور اپنے معاشی وسائل پر قدرت رکھتی ہوں، فوج اور تمام ریاستی اداروں پر پارلیمنٹ کی بالادستی ہو۔ سامرجی اور اسٹیبلشمنٹ کی بنائی ہوئی سابقہ خارجہ پالیسی کے مقابلے میں اپنے قومی مفادات کی بنیاد پر آزاد خارجہ پالیسی کا

حکومت اورحزب اختلاف، گرینڈ اتحاد کے نعرے

موجودہ حکومت ساڑھے تین سال پورے کر چکی ہے اور ملک کی معاشی، سیاسی اور انتظامی صورت حال پہلے سے بدتر ہے۔ ملک معاشی طور پر کنگال ہے۔ مہنگائی آسمانوں سے باتیں کر رہی ہے، عام شہری کی زندگی اجیرن ہے، بجلی، گیس، تیل کا بحران ہے، صنعتی ارتقاء اور سرمایہ کاری مندی کی طرف ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ملک دہشت گردی، مذہبی انتہا پسندی، شدت پسندی کا شکار ہے اور قانون کی حکمرانی نہ ہونے کی وجہ سے بیرونی سرمایہ کار تمام تر ترغیبات کے باوجود سرمایہ لگانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ عوامی اہمیت کے تمام ادارے سٹیل مل، پی آئی اے، پی ٹی سی ایل، ریلوے، بجلی، گیس، تیل کے محکمے تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ شہروں میں مافیہ کا قبضہ ہے، ہیروئین، ڈرگ، اسلحہ کی اسمگلنگ، زیر زمین معیشت اور کرپشن کا بے پناہ روپیہ ملک سے باہر جا رہا ہے۔ بیروزگاری میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ ذرعی معیشت جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے ہاتھ میں ہے۔ ذرعی اجناس کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے ان کی دولت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے اور ان کی دولت وآمدنی ٹیکس سے بھی مستثنٰی ہے۔ سالانہ بجٹ کا ابھی بھی بیشتر حصہ دفاعی وغیر پیداواری اخراجات کا ہے۔ اندرونی معاشی اور تمام تر بیرونی دباؤ کے باوجود ہماری دفاعی و خارجہ پالیسی کے امور پر فوج اور اس کی اسٹیبلشمنٹ کا غلبہ ہے۔ پارلیمنٹ کی بالادستی نہیں ہے۔ سامراجی ممالک خاص کر امریکہ سے دفاعی اور اور افغان پالیسی کے حوالے سے چند معاملات پر اختلافات کے باوجود حکمران امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے اور اسکی کو اپنی خارجی و معاشی پالیسیوں کا محور سمجھتے ہیں۔ حکمرانوں کی سماجی تبدیلی تو دور کی بات ہے عوامی اہمیت کے کسی بھی مسئلے کو حل کرنے کے بارے میں کوئی کمٹمنٹ ہی نہیں ہے۔ بس اپنی پانچ سال کی حکمرانی کو پورا کرنے کے لئے ہر قسم کے مفاد پرست گروہ اور افراد کو حکمران اتحاد میں جمع کر لیا گیا ہے، جن کو لوٹ گھسوٹ کے علاوہ کسی چیز سے غرض نہیں ہے۔

حزب اختلاف کی سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ (نواز) ہے جو دوستانہ حزب اختلاف اس لئے ہے کہ حکومت کی کسی بنیادی معاشی، دفاعی و خارجہ پالیسی سے انہوں نے بنیادی اختلاف کا اظہار نہیں کیا ہے۔ ملک میں بنیادی معاشی اصلاحات، صنعتی ارتقاء اور جمہوری اداروں کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ جاگیرداری باقیات اور بڑی زمینداریاں ہیں۔ جن کے خاتمہ کے لئے مسلم لیگ (ن) نے نہ تو اپنی پالیسی کا حصہ بنایا ہے اور نہ ہی کبھی اظہار کیا ہے۔ ملکی سالانہ بجٹ میں ٹیکس کی بنیادوں کو وسیع کرنے کے لئے معیشت دانوں کے مطالبے کے باوجود حکومت اور حزب اختلاف ذرعی آمدنی پر ٹیکس نہ لگانے پر متفق ہیں۔ ملک میں دہشت گردی، مذہبی انتہاپسندی پر بالکل خاموش ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شدت پسندوں اور مذہبی انتہاء پسندوں کے لئے ابھی بھی نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ خارجہ پالیسی کے حوالے سے بھارت کو دشمن نمبر ایک نہ ماننے اور تعلقات کو بہتر کرنے کے ایک دو بیانات کے بعد خاموشی اختیار کی ہوئی ہے۔ خارجہ پالیسی تزویراتی گہرائی، دفاعی پالیسیوں میں بنیادی تبدیلیاں لانے کے لئے عوامی رائے عامہ کو ہموار کرنے کی پالیسی اختیار نہیں کی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اختلافات محض حکمران (governance) کے طور طریقوں پر ہیں اور وہ آنے والے الیکشنوں کی تیار پر ہیں اور اس کے لئے کبھی کبھی گرینڈ الائنس کا نعرہ لگاتے ہیں۔ مگر ان کا یہ گرینڈ الائنس بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ دوسری نام نہاد حزب اختلاف کی جماعتیں یا تو حکومت پر دباؤ ڈال کر مفاد حاصل کرنے پر لگی رہتی ہیں جن میں جے یو آئی اور ایم کیو ایم شامل ہیں۔ عمران خان کی اچھل کود ہے یا پھر مذہبی بنیاد پرست و انتہا پسند ہیں جن کا اپنا ایجنڈا ہے جو ملک کو مزید تاریک گہرائیوں کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔

ہماری قوم پرست پارٹیاں خاص کر سندھ اور بلوچستان سے متعلق اپنے اپنے صوبوں سے نکل کر وسیع پیمانے کی سیاست کرنے کے لئے ابھی تیار نہیں ہیں۔ بلوچستان میں تو حکمرانوں اور اسٹیبلشمنٹ کی پالیسی کی وجہ سے انتہا پسندی اور علیحدگی پسندی کو عروج ملا ہے۔ ملکی پارلیمانی سیاست پر یقین رکھنے والے گروپ ابھی تک مخمسے کا شکار ہیں اور ان کی پارلیمانی سیاست کوئٹہ اور اسلام آباد کے ایوانوں تک ہے۔ سندھ کی قوم پرست پارٹیوں کا محورِ سیاست پی پی پی یا ایم کیو ایم کی مخالفت ہے۔ مرکز سے اپنے قومی حقوق اور صوبائی خود اختیاری کیسے حاصل ہوگی، تمام تر معاشی وسائل کس طرح سے صوبوں کے کنٹرول میں آئیں گے اور معاشی ترقی اور سماجی تبدیلی کیسے آئے گی اس کے لئے سیاسی نقطہ نظر میں تبدیلی اور طویل جدوجہد کی ضرورت ہے۔

اس انتہائی پیچیدہ سیاسی صورت حال میں حکمران طبقات کے ذاتی اور گروہی مفادات کے مقابلے میں ایک ایسی منظم سیاسی قوت کی ضرورت ہے جو ملک میں جاگیری باقیات اور بڑی زمینداریوں کا خاتمہ کرتے ہوئے ذرعی معیشت میں انقلاب برپا کرنے اور 60 فیصد دیہی آبادی کی زندگی بدلنے کا نظریہ و کمٹمنٹ رکھتی ہو۔ صنعتی ترقی سامراج سے معاشی آزادی چاہتی ہو۔ ایک ایسی حقیقی وفاقیت اور پارلیمانی جمہوریت جس میں وفاقی اکائیاں خودمختار اور اپنے معاشی وسائل پر قدرت رکھتی ہوں، فوج اور تمام ریاستی اداروں پر پارلیمنٹ کی بالادستی ہو۔ سامرجی اور اسٹیبلشمنٹ کی بنائی ہوئی سابقہ خارجہ پالیسی کے مقابلے میں اپنے قومی مفادات کی بنیاد پر آزاد خارجہ پالیسی کا

سرائیکی و ہزارہ صوبے کا مطالبہ

اختر حسین ایڈووکیٹ

پاکستان میں وفاقیت اور قومی حقوق کے مسئلے پر بحث کی ضرورت

آج کل پاکستان میں سرائیکی صوبے کا مطالبہ پھر زوروں پر ہے اور پاکستان کے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے بھی ایک سے زیادہ مرتبہ اپنے بیانات میں سرائیکی صوبے کے قیام کے بارے میں کہا ہے۔ اس سلسلے میں بعض سیاسی راہنماء بہاولپور صوبے کا بھی مطالبہ کر رہے ہیں۔ ادھر ساٹھ سالوں کی جدوجہد اور مطالبے کے نتیجے میں شمال مغربی سرحدی صوبے کو خیبر پختون خواہ کے نام سے بدلنے کے بعد ہزارہ صوبے کا مطالبہ بھی شروع ہو گیا ہے۔ ساتھ ہی بعض سیاسی عناصر پاکستان کو کئی صوبوں میں انتظامی یعنی ڈویژنز کی بنیاد پر تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ وزیر اعظم جن کا تعلق سرائیکی زبان بولنے والے علاقے سے ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے سیاسی مخالفین پر محض برتری حاصل کرنے کے لئے آئندہ انتخابات کی مصلحتوں یا بیان بازی کی حد تک بات کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں سنجیدگی اس لئے نظر نہیں آتی کیونکہ آج تک پاکستان پیپلز پارٹی نے نہ تو اس کو اپنے پروگرام میں شامل کیا ہے نہ ہی اس انتہائی اہم مسئلے کو سنجیدگی سے لے رہی ہے۔ پیپلز پارٹی کے علاوہ بھی بڑی پارلیمانی یا پارلیمنٹ سے باہر سیاسی پارٹیاں مسلم لیگ (ن)، (ف)، (ق) وغیرہ اس مسئلے پر رائے کا اظہار نہیں کر رہے ہیں یا سیاسی مصلحتوں کی بنیاد پر پہلو تہی کر رہے ہیں۔ حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو ہمارے حکمران طبقات پاکستانی ریاست میں صوبوں کی تقسیم کو اپنی حکمرانی اور مفادات کی بندر بانٹ کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتے، انہوں نے ہمیشہ پاکستان کے قیام کی بنیادوں یعنی 23 مارچ 1940ء کی قرارداد کی بنیاد پر ایک وفاقی جمہوری ریاست کے قیام کی نفی کی ہے۔ واضح رہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے کبھی بھی 1935ء کے آئین میں دیے گئے وفاق یا اس میں موجود صوبائی خودمختاری کو تسلیم نہیں کیا اور ہمیشہ صوبوں کی زیادہ سے زیادہ خودمختاری کا مطالبہ کیا تھا۔ اس لئے 1940ء کی قرارداد میں کہا گیا تھا کہ:

''وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے جیسا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی حصوں میں ہے یکجا ہو کر آزاد ریاستیں بن جائیں جن کی ترکیبی اکائیاں بااختیار اور خودمختار ہوں۔''

1971ء میں پاکستان کے ٹوٹ جانے اور بنگلہ دیش کے قیام کے بعد بھی نئے پاکستان کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کی سعی کی گئی یہی وجہ ہے کہ آج بھی ایک طرف تو نئے صوبوں کے قیام کا مطالبہ کیا جا رہا ہے اور کچھ صوبے جو وفاق میں شامل نہیں وہ علیحدگی یا مکمل آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ لہٰذا پاکستانی وفاق کے مسئلے پر آج بھی نہ صرف ایک سنجیدہ بحث بلکہ اس کو حل کرنے کے لئے سیاسی کمٹمنٹ کی ضرورت ہے۔

دراصل سیاسی تاریخ کے اس پہلو پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ غیر منقسم انڈیا مختلف لسانی وحدتوں، تہذیبوں، ثقافتوں، علاقائی ریاستوں کا ملک تھا جو علاقے اپنی اپنی تاریخی، جغرافیائی، تہذیبی، مذہبی اور معاشی ساخت کے ساتھ انتظامی وجود رکھتے تھے۔ اپنی لسانی، تہذیبی، تاریخی، جغرافیائی اور معاشی ساخت کی بنیاد پر قائم وحدتوں کو سماجی سائنس کی زبان میں قومیت اور سرمایہ دارانہ معاشی ترقی کے ساتھ ایک قوم کا درجہ دیا جاتا ہے لہٰذا غیر منقسم انڈیا یا موجودہ بھارت اور پاکستان دونوں کثیر القومی ریاستیں اور آزاد وفاقی مملکتیں ہیں۔ پاکستان کا قیام ان مسلمان اکثریت کے صوبوں اور واحدتوں جن میں سندھ، پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ (موجودہ خیبر پختون خواہ) اور مشرقی بنگال (موجودہ بنگلہ دیش) اور ان آزاد ریاستوں کی بنیاد پر ہوا جن میں خیر پور، بہاولپور، قلات، دیر، امب، سوات وغیرہ ان ریاستوں نے قانون آزادی ہند 1947ء کی بنیاد پر پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ ان میں سے بعض ریاستوں نے ایک معاہدے کے تحت پاکستان میں شمولیت اختیار کی جس کے تحت صرف دفاع، امورِ خارجہ بین الصوبائی مواصلات ہی کے محکمے مرکزی/ وفاقی حکومت کے حوالے کئے گئے تھے، ریاست قلات (موجودہ بلوچستان) کو تو کرنسی بھی اپنی رکھنے کا حق تھا۔ لہٰذا آزادی کے بعد دونوں آزاد مملکتوں یعنی بھارت اور پاکستان کی سیاسی پارٹیوں کے لئے ضروری تھا کہ نئی قائم ہونے والی آزاد و خودمختار مملکتوں کے اندر بسنے والی وفاقی اکائیوں، وحدتوں اور قومیتوں کے ساتھ عمرانی معاہدہ تشکیل دیں یعنی آئین سازی میں ان کے حقوق و فرائض کا تعین برابری کی بنیاد پر ان کے منتخب نمائندوں کی رائے کو مقدم سمجھتے ہوئے کریں۔ اور آزادی کے وقت پہلے سے قائم صوبوں یا ریاستوں کے علاوہ بھی لسانی، تہذیبی، ثقافتی، تاریخی، جغرافیائی حد بندیوں اور نفسیاتی ساخت کے مطابق قومی اکائیاں تشکیل دیں تاکہ وہاں کے عوام اپنی معاشی و تہذیبی ترقی کر سکیں اور وفاق کے اندر صوبوں یا ریاستوں کی بنیاد پر ایک حقیقی وفاقی مملکت قائم ہو۔

بھارت میں آئین سازی اور اس کے بعد بھی اس مسئلے کو انتہائی سنجیدگی سے لیا گیا۔ انڈین نیشنل کانگرس نے اسے اپنے 1945ء کے انتخابی مینی فیسٹو میں لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تشکیل نو کے مسئلے کو شامل کیا اور 1948ء میں باقاعدہ پارٹی منشور کا حصہ بنایا اور 1949ء میں بھارتی حکومت نے بھی اس اصول کو منظور کر لیا اور

1953 میں ''ریاستوں کی تنظیم نو کمیشن'' مقرر ہوا۔ کانگریس چونکہ بھارتی سرمایہ دار طبقے کی جماعت ہے لہٰذا انہوں نے جاگیرداری اور بڑی زمینداریوں کے خاتمے اور بنیادی زرعی اصلاحات کو اولیت دی جس سے آئندہ کی سرمایہ دارانہ ریاست کی تشکیل میں آسانیاں پیدا ہوئیں مگر لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی از سرِ نو تشکیل کے مسئلے پر کانگریس بھی کافی عرصے تک سیاسی و انتخابی مصلحتوں کا شکار رہی، کبھی بنگال اور بہار کو ایک ریاست بنانے کبھی پنجاب کی پنجابی اور ہندی بولنے والی آبادی بشمول دہلی مہا پنجاب کی رائے سامنے آئی مگر اس مسئلے پر بھارتی کمیونسٹوں نے مسلسل جدوجہد کی اور دیکھا جائے تو آج بھارت کی 22 سے 32 ریاستوں کا قیام کمیونسٹوں اور بائیں بازو کی پارٹیوں کی لسانی و تہذیبی بنیادوں پر ریاستوں کی تشکیل نو کے مسئلے پر مسلسل غیر مصالحانہ جدوجہد کا نتیجہ ہے اور سوائے دو تین جگہ کے آج یہ مسئلہ جمہوری انداز میں جمہوری رائے سے حل ہوا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ بھارت میں مسلسل آئین کی حکمرانی قائم ہے، جمہوری ادارے مضبوط اور پارلیمنٹ کی بالادستی ہے، فوج اور غیر جمہوری قوتیں ماورائے آئین اقدامات کی جرأت نہیں کر سکتے۔

پاکستان بھی ایک کثیر القومی ریاست ہوتے ہوئے یہاں کے حکمرانوں نے اس حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کیا، اس ریاست کو کثیر القومی اور جمہوری بنیادوں پر ایک حقیقی وفاقی مملکت تشکیل دینے کی بجائے مذہبی بنیادیں تلاش کرنا شروع کیں، جمہوریت اور وفاقیت کی نفی کرتے ہوئے مضبوط مرکزیت کی ریاست تشکیل دینا شروع کی۔ دراصل پاکستان کی باگ دوڑ ایک جمہوری پارٹی کی بجائے جاگیرداروں، بڑے زمینداروں، قبائلی سرداروں، نوکر شاہی اور ملاؤں کے ہاتھ میں آگئی اور انہوں نے امریکی سامراجی تابعداری کے تحت مذہب کو سماجی تبدیلی کی قوتوں کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور پاکستان کو بیرونی طور پر سامراجی قوتوں کا آلۂ کار بنا دیا اور اندرونی طور پر جاگیری باقیات اور بڑی زمینداریوں کو قائم رکھتے ہوئے فوجی نوکر شاہی کے ساتھ حصہ داری شروع کر دی، آئین سازی میں 1940ء کی قرارداد اور قائداعظم کی آئین ساز اسمبلی 11 اگست 1947ء کی نظری تقریر کو بنیاد بنانے کی بجائے قراردادِ مقاصد کو نظری بنیاد بنایا گیا اور مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کی عددی اکثریت کو ختم کرنے کے لئے مغربی حصے میں موجودہ صوبوں یعنی سندھ، پنجاب، سرحد و بلوچستان کو بھی ختم کر کے 1954ء میں قانون سازی کے ذریعے مغربی پاکستان کا ون یونٹ قائم کر دیا۔ اس طرح مشرقی و مغربی پاکستان کی نام نہاد برابری کے نام پر پاکستان کی کثیر القومی وفاقی روح کو ہی ختم کر دیا۔ آبادی کے لحاظ سے 1961ء کی مردم شماری کے مطابق بھی مشرقی پاکستان کی آبادی 5,08,40,235 اور مغربی پاکستان کی آبادی 4,28,80,373 تھی اس طرح دیکھا جائے تو بین الاقوامی جمہوری اصولوں یعنی ایک فرد ایک ووٹ کے اصول کو نہ صرف ختم کیا گیا بلکہ مغربی پاکستان کی مختلف قومیتوں وفاقی اکائیوں کے سیاسی، تہذیبی و معاشی حقوق کو بھی ختم کر دیا گیا۔ ان اقدامات نے ایک بڑی قومی اور صوبائی خودمختاری کے حقوق کی جدوجہد کو جنم دیا۔ قومی و جمہوری حقوق کے برخلاف تشکیل کردہ 1956ء کے آئین کو عوام نے خاص کر مشرقی پاکستان، سندھ، سرحد، بلوچستان اور پنجاب کے ترقی پسند عوام نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سیاسی جدوجہد کے ابھار کو ختم کرنے اور ملک میں معاشی و سماجی status quo کو قائم رکھنے کے لئے فیلڈ مارشل ایوب خان کی قیادت میں پہلا مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ اور انہی بنیادوں پر بلکہ پہلے سے بھی زیادہ مرکزیت اور شخصی حکمرانی پر مبنی 1961ء کا دستور دیا گیا۔ اس دستور کو (حبیب جالب کی زبان میں ''صبح بے نور کو'') بھی عوام نے یکسر مسترد کر دیا۔ اور ایک نئی بڑی سیاسی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ اس دس سالہ تاریک مارشل لائی دور کا خاتمہ جنرل یحیٰی خان کی قیادت میں 1969ء میں دوسرے مارشل لاء سے ہوا۔ جس نے ون یونٹ توڑنے، ایک فرد ایک ووٹ کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے نئے انتخابات کرانے اور نئے آئین کی تشکیل کا وعدہ کیا۔ 1970ء میں پہلے عام انتخابات ہوئے جن میں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے مکمل اکثریت حاصل کر لی، پنجاب اور سندھ میں پیپلز پارٹی اور سرحد و بلوچستان میں نیپ اور جے۔ یو۔ آئی نے حاصل کی۔ مگر مغربی پاکستان کے جاگیرداروں اور فوجی نوکر شاہی نے آئندہ اسمبلی کی ساخت اور متوقع آئین سازی کا اندازہ کرتے ہوئے قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے اور اقتدار عوامی لیگ کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ جس نے ایک خونی جدوجہد کو جنم دیا اور لاکھوں انسانوں کی قربانی کے بعد مشرقی پاکستان ایک آزاد خودمختار ملک بنگلہ دیش بن گیا اور مغربی پاکستان میں نئے سرے سے قومی حقوق، وفاقیت اور صوبائی خودمختاری کے مسائل کو حل کرنے کا مسئلہ درپیش رہا۔ نئے آئین کی تشکیل (1973ء کے آئین) میں بھی 1940ء کی قرارداد پاکستان کے اصولوں، قومی حقوق اور قومیتوں کی بنیاد پر صوبوں کی تشکیل یا نئے صوبوں کے قیام کے مسائل کو حل نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس میں اصولی نشاندہی بھی نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ مسائل آج بھی اپنی جگہ پر قائم ہیں اور قومی حقوق کے حصول اور صوبائی خودمختاری کی حدود طے کرنے کی جدوجہد جاری ہے۔

قومی حقوق اور صوبائی خودمختاری کے حصول کی جدوجہد جاگیرداری نظام اور بڑی زمینداریوں کے خاتمے سے جڑی ہے

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ پاکستان ایک کثیر القومی ملک ہے اس اس میں بسنے والی مختلف قومیں اپنے برابر معاشی و سیاسی حقوق اس لئے چاہتی ہیں کہ اپنے صوبوں کے معاشی وسائل پر مکمل قدرت رکھتے ہوئے ہی ان کے عوامی معاشی، سماجی، لسانی، تہذیبی اور ثقافتی طور پر ترقی کرتے ہوئے انسانی زندگی کی اعلیٰ منازل طے کر سکتے ہیں اور یہ سماجی ترقی محکومی یا ایک قوم کی دوسرے پر بالادستی سے نہیں ہو سکتی اور نہ ہی ایک قوم کے اندر بالادست طبقے عوام

کی معاشی و تہذیبی ترقی کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ محض صوبائی خودمختاری تو چھوٹی قومیتوں کے حکمران طبقات بھی چاہتے ہیں کیونکہ وہ بالادست قوم اور ان کی حواری اور پشت پناہ فوجی وسول نوکر شاہی کو اپنے ذاتی مفادات اور حکمرانی میں رکاوٹ سمجھتے ہیں جس کی مثال ون یونٹ کے خلاف ایک بڑی جدوجہد کی ہے جس میں ہاری، محنت کش، درمیانے اور مظلوم طبقات کے ساتھ ساتھ چھوٹی قومیتوں کے بڑے زمیندار اور بالادست طبقے بھی شامل تھے۔ لیکن ون یونٹ کے خاتمے کے بعد چھوٹی قومیتوں کے بالادست طبقات کے ایک حصے کا مسئلے حل ہو گیا اور وہ اپنے اپنے صوبوں میں حکمرانی کرنے لگے اور بڑے صوبے کے حکمرانوں اور نوکر شاہی سے ساجھے داری بھی۔ اگر مزید گہرائی سے دیکھا جائے تو ون یونٹ کے قائم کرنے میں بھی پنجاب کے بالادست طبقات اور نوکر شاہی کے ساتھ چھوٹے صوبوں کے جاگیرداروں، خانوں اور سرمایہ داروں کا ایک حصہ شامل تھا اور وہ ون یونٹ کا دفاع کرتے رہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ تمام قومیتوں کے محنت کش و محنت کار عوام و درمیانے طبقے کے معاشی، سیاسی، لسانی، تہذیبی و ثقافتی ترقی کے مسائل ایک طرح کے ہیں اور تمام ہی اپنی اپنی قومیتوں کے بالادست طبقوں کے مظالم و استحصال کی چکی میں پستے رہتے ہیں، اس لئے ان کا اتحاد و ایکا ضروری ہے۔ قومی نابرابری یا ایک قوم کی دوسری پر بالادستی کی وجہ سے چھوٹی قوموں کے بالادست طبقے عوام کو بھی اپنے حق میں استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا تمام قومیتوں کے مظلوم طبقات و عوام کی جدوجہد برابر قومی حقوق کے حصول ایک قوم کی دوسرے پر بالادستی کے خلاف ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی انکی جدوجہد اپنی قوم کے جاگیرداروں، بڑے زمینداروں، خوانین اور سرداروں کے خلاف بھی اس طرح ضروری و لازم ہے اور اس جدوجہد کو خانوں میں بانٹا نہیں جا سکتا، عملی تجربے سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ تمام قومیتوں اور صوبوں کے حکمران طبقات جن میں بڑے زمینداروں اور ان کی پشت پر فوجی اسٹیبلشمنٹ کی بالادستی ہے ان کے مفادات ایک ہیں اور وہ اس پر متحد ہیں کہ ملک میں جاگیری باقیات و بڑی زمینداروں کو قائم رہنا چاہئے اور ان کے طبقاتی مفادات کا ایکا اس حد تک ہے کہ زرعی اصلاحات تو کجا، زرعی آمدنی پر انکم ٹیکس بھی لگنے نہیں دیتے جبکہ بڑے زمینداروں کی آمدنی کروڑوں میں ہے مگر زرعی آمدنی کو انکم ٹیکس کے قانون سے ہی نکال دیا گیا ہے جیسا کہ یہ آمدنی ہی نہیں ہے اور ملک کے معاشی طور پر کنگال ہونے کے باوجود ٹیکس کے دائرے کو وسیع نہیں کیا جاتا اور تمام تر بوجھ صرف غریب عوام پر ہی پڑتا ہے اس پر تمام پارلیمنٹ متفق ہے خواہ اس کے اراکین کا تعلق کسی بھی پارٹی سے ہو۔ پانی کی تقسیم کے مسئلے کو ہی لے لیجئے۔ یہ مطالبہ بالکل صحیح ہے کہ پہلے تو 1991 کے پانی کے معاہدے پر عمل ہونا چاہیے اور دوسرا یہ کہ صوبوں کے درمیان پانی کی تقسیم کو بین الاقوامی قوانین و اصولوں کے مطابق نئے سرے سے مذاکرات کے ذریعے منصفانہ طور پر طے ہونا چاہئے۔ تاکہ کسی صوبے کی حق تلفی نہ ہو اور زرعی معیشت میں برابر ترقی ہو سکے۔ لیکن کبھی غور کیا گیا ہے کہ پانی کی موجودگی تقسیم کے تحت جو پانی سندھ میں آتا ہے وہ دریا یا نہر کے آخری حصے پر موجود بڑے زمیندار کو تو ملتا ہے مگر اس کے اوپری یا پہلے حصے پر موجود چھوٹے زمین کے مالک کو نہیں ملتا۔ اسلئے پانی کی تقسیم کا جھگڑا تو ایک صوبے کے اندر بھی ہے اور یہ جھگڑے بڑی زمینداریوں کی وجہ سے ہیں ہمارے ملک میں موجود جاگیری باقیات اور بڑی زمینداریوں کی وجہ سے ہی ہر صوبے کے بڑے زمیندار دوسرے صوبے کے ساتھ معاملات طے کرنے اور اپنے صوبے کے اندر بھی محض اپنے طبقاتی و معاشی مفاد کو مقدم رکھتے ہیں۔ اس لئے ہمارا کہنا ہے کہ قومی حقوق یا صوبائی خودمختاری کا مسئلہ محنت کش اور درمیانے طبقے اور تمام محنت کار عوام کا ہے جو اسے اپنی طبقاتی جدوجہد کا حصہ سمجھتے ہوئے تمام قوموں کے مظلوم طبقات و عوام کے ساتھ مل کر ہی حل کر سکتے ہیں کیونکہ یہ جدوجہد جہاں قومی بالادستی کے خلاف ہے وہیں جاگیرداری بڑی زمینداریوں اور بالادست طبقات کے خلاف بھی ہے۔

نئے صوبوں کے قیام کا مسئلہ

پاکستان ایک کثیر القومی وفاقی ریاست میں صوبوں کی تشکیل بھی قومی بنیادوں پر ہی ہونی چاہئے۔ محض لسانی یا انتظامی بنیادوں پر نہیں کسی ایک قوم یا قومیت کی شناخت یا وجود کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ایک زبان ہو، عوام کی مشترکہ تہذیب و ثقافت ہو، اس کا ایک تاریخی پس منظر، جغرافیائی محلِ وقوع اور حدود نیز ایک معاشی نفسیاتی ساخت بھی ہو۔ محض لسانی یا انتظامی بنیادوں پر وفاقی اکائیوں کی تشکیل عوام کے اندر نفاق، تقسیم اور وفاق کی مرکزیت کو اور زیادہ مضبوط کرے گا جس کا فائدہ بالادست اور حکمران طبقات کو ہی ہوگا۔ جو لوگ محض انتظامی بنیادوں پر صوبوں کو تشکیل دینا چاہتے ہیں وہ دراصل وہی قوتیں ہیں جو اس ملک کو کثیر القومی ماننے سے انکار کرتے ہیں اور جن کا مقصد عوام کو تقسیم کرنا اور محض حکمرانی کرنا ہے، انہی پالیسیوں کی وجہ سے پاکستان پہلے ٹوٹ چکا ہے۔ لیکن موجودہ صوبوں کی ازسرِ نو تشکیل یا نئے صوبوں کا قیام انتہائی پیچیدہ مسئلہ ہے اور یہ جمہوری بنیادوں پر عوام کی رائے سے ہی طے ہونا چاہئے۔ اس میں سماجی سائنس کی بنیاد پر تجزیات اور جمہوری رویوں کی ضرورت ہے، سرائیکی صوبے کا مطالبہ سرائیکی زبان، تہذیب و ثقافت، تاریخی و جغرافیائی نقطہ نظر سے صحیح ہے اور قومی بنیادوں پر ہی عوام کی رائے سے تشکیل پانا چاہئے۔ بہاول پور تو سرائیکی زبان و قومیت کا ایک حصہ ہے۔ بہاول پور ریاست کے پرانے حکمرانوں کے خانوادے، اپنی پرانی ریاست کی بحالی چاہتے ہیں جس پر انکی حکمرانی و بالادستی اور جاگیر اثرات، رعب اور دبدبہ جاری رہے۔ ہم جاگیری باقیات ختم کر کے عوام کے حقوق کا حصول چاہتے ہیں جس میں عام شہری تعلیمی، معاشی و سماجی طور پر برابر ترقی کر سکے۔

جہاں تک ہزارہ صوبے کے مطالبے کا تعلق ہے،

باقی صفحہ نمبر 11 پر

مارکسی نظریہ داں ــ ڈاکٹر حسان ۱۹۲۱ء۔۱۹۸۵ء

مسلم شمیم

شب سیہ کا مسافر ، وہ صبحِ نو کا سفیر
وہ سنگِ میل نہیں تھا ، نشانِ منزل تھا

خالد علیگ کا یہ شعر ڈاکٹر حسان کی پوری زندگی کا عکس و آئینہ اور ایک ایسا خراجِ تحسین ہے جس کا وہ واقعی استحقاق رکھتے تھے۔ اُنھوں نے ساری زندگی مارکسی فلسفے کی تفہیم کے ساتھ اُس کی عملی تفسیر پیش کرنے میں بسر کی۔ اِس فکر کی ترویج و اشاعت کے لیے اُنھوں نے جدوجہد کا راستہ اپنایا۔ وہ کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی جانشیں تنظیم عوامی ادبی انجمن کے بانی سکریٹری جنرل کی حیثیت سے تادمِ آخر یعنی ۱۹۸۵ء تک اُس کو فعال رکھا۔ ڈاکٹر حسان نے عوامی ادبی انجمن کے تاسیسی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''آج کے معاشی ، سیاسی اور سماجی پس منظر میں ترقی پسند ادیبوں اور دانش وروں کا فریضہ بہت بڑھ گیا ہے۔ اُنھیں ایک طرف حکمراں طبقات کی آئیڈیالوجی سے لڑنا ہے اور دوسری طرف ترقی پسندی کو اپنے متوسط طبقے کے مفادات کی بھینٹ چڑھانے والے ادیبوں ، شاعروں اور دانش وروں کی بزدلی اور موقع پرستی کو بھی بے نقاب کرنا ہے، کیونکہ آج دنیا دو واضح نظریاتی اور سماجی حلقوں میں بٹ چکی ہے۔ پھر سیاست کی طرح ادب میں بھی کوئی غیر جانب دار رہنے کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے؟ اس لیے آج کے ترقی پسند ادیبوں اور دانش وروں کا کام یہ ہے کہ وہ اشتراکی حقیقت نگاری کے نظریے سے لیس ہو کر اپنے ادب اور آرٹ کو بہتر سماج کی تخلیق اور تعمیر کے لیے استعمال کریں''۔

ڈاکٹر حسان کی سوچ اور فکر کھلی کتاب کے مانند تھی۔ وہ ایک بے باک اور نڈر دانش ور تھے اور جرأتِ انکار اُن کی سرشت اور فکر و نظر میں شامل تھی۔ انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال سے پاک ایک حسین سماج کی تشکیل اور حکمراں طبقوں کی بالادستی کے خاتمے کے لیے ڈاکٹر حسان نے عملی جدوجہد کی، اور اُن کی پوری زندگی اِسی جدوجہد سے عبارت تھی۔ اِس جدوجہد کی پاداش میں اُنھیں قید و بند کی صعوبتوں سے بارہا گزرنا پڑا۔ وہ بصد خشوع و خضوع اپنے آدرش کو آگے بڑھانے میں سرگرمِ عمل رہے اور اُنھوں نے اپنے مارکسی علم سے ملک کی عوامی تحریکوں کو گم راہی اور موقع پرستی سے بچانے کی تگ و دو جاری رکھی۔ وہ ملک کے اُن معدودے چند مارکسی دانش وروں میں تھے جو نہ صرف مارکسی فلسفے کا ادراک رکھتے تھے بلکہ اِس نظریے کی روشنی میں اپنے سماج کے طبقاتی مسائل اور مفادات کو بھی سمجھتے تھے اور سماج کی طبقاتی بنیادوں کی بیخ کنی کے لیے انقلاب کے پرچارک تھے۔ ڈاکٹر حسان کی زندگی کا محور انسانیت کے لیے تاب ناک مستقبل انقلابِ آزادی اور ملک کے مظلوم اور کچلے ہوئے عوام کی طبقاتی سیاست تھا۔ مرحوم نے عملی اور شعوری طور پر استحصال زدہ طبقات کی سیاست کو اپنا آدرش بنالیا تھا۔ وہ ساری عمر اِسی آدرش کے لیے سرگرداں رہے اور اپنے اِس آدرش یعنی اپنے خواب کی تعبیر دیکھنے کے متمنی بھی تھے اور سرگرمِ کار بھی۔

ڈاکٹر حسان کا آبائی تعلق حیدرآباد دکن سے تھا اور وہ گاؤمٹ پلی، ضلع میدک، حیدرآباد دکن میں ۱۹ر مارچ ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر حسان گویا کامریڈ حسن ناصر اور مخدوم محی الدین کے ہم وطن ہونے کا فخر رکھتے تھے۔ اُن کی تعلیمی زندگی کا بیش تر حصہ حیدرآباد دکن میں گزرا۔ اُنھوں نے ۱۹۳۹ء میں ضلع محبوب نگر حیدرآباد سے میٹرک کی سند حاصل کی اور ۱۹۴۶ء میں اُنھیں جامعۂ عثمانیہ سے سیاسیات میں ایم۔ اے کی ڈگری تفویض ہوئی۔ وہ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۴ء تک لندن یونیورسٹی سے وابستہ رہے اور وہاں سے سیاسیات میں پی ایچ۔ ڈی کیا۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں اپنے پورے خاندان کے ساتھ کراچی سندھ منتقل ہو گئے اور یہیں کے ہو رہے۔ شعبۂ تدریس سے وابستگی کا آغاز ۱۹۴۶ء میں جامعۂ عثمانیہ کے حیدرآباد دکن کے شعبۂ سیاسیات میں سینیر لکچرر سے ہوا اور وہ جامعۂ عثمانیہ سے ۱۹۵۲ء تک وابستہ رہے۔ ۱۹۵۲ء میں نقلِ مکانی کے بعد وہ کراچی میں اردو کالج کے شعبۂ سیاسیات میں لکچرر مقرر ہوئے اور اردو کالج کراچی میں ۱۹۵۷ء تک اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز رہے۔ اِس دورانیے میں وہ کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ سیاسیات کے اعزازی لکچرر رہے۔ ۱۹۶۴ء میں حاجی عبداللہ ہارون کالج لیاری کے صدرِ شعبۂ سیاسیات اور وائس پرنسپل کے منصب پر فائز رہے اور بعد میں مذکورہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۵ء میں وفاقی گورنمنٹ اردو آرٹس کالج کے شعبۂ سیاسیات کے صدر کی حیثیت سے فرائضِ منصبی انجام دیتے رہے اور ۱۹۸۱ء میں وہیں سے سبک دوش ہوئے۔ ۲۷ر فروری ۱۹۸۵ء کو کراچی میں اُن کا انتقال ہوا اور سخی حسن قبرستان کراچی میں دفن ہوئے۔ یہ اُن کی زندگی کے کوائف کا اجمالی آئینہ ہے۔

ڈاکٹر حسان کا انتقال ترقی پسند حلقوں اور بائیں بازو کی تنظیموں اور جماعتوں کے لیے ایک بڑا تاریخی سانحہ تھا اور اُن کی وفات سے شہرِ کراچی خصوصی طور پر اور پاکستانی معاشرہ عمومی طور پر غریب تر نظر آنے لگا ، چنانچہ اُن کی وفات کے تین ہفتے بعد ملک کی بیس اہم ترین مزدور تنظیموں اور ادبی اداروں کی طرف سے ایک مشترکہ ریفرنس منعقد ہوا جس میں شہر کے معتبر شاعروں دانش وروں اور ورکرز یونین کے رہ نماؤں نے خطاب کیا اور مرحوم کو اُن کے کارناموں اور سماج کے لیے اُن کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ اِس اجتماع میں ایک جامع قراردادِ تعزیت بھی پیش کی گئی۔ یہ تعزیتی قرارداد اِس مشترکہ تعزیتی جلسے میں شریک بیس

تنظیموں کے رہ نماؤں کے ایما پر بابرایاز نے لکھی اور جلسے کے ناظم موجودہ ورکرز پارٹی پاکستان کے جنرل سکریٹری اختر حسین نے پڑھی۔ مذکورہ قرارداد کے ابتدائی حصے کا متن آج بھی معنویت کا حامل ہے، اور تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر وہ اقتباس نذرِ قارئین ہے:

''بروز بدھ، بتاریخ ۲۷ فروری ۱۹۸۵ء کی صبح مشہور مارکسی دانش ور اور انقلابی رہ نما ڈاکٹر م۔ ر۔ حسان دل کی دھڑکن بند ہونے کے سبب، ہم سب سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ اُن کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے مزدوروں طلبا، خواتین، ادیبوں اور سیاسی کارکنوں کی جانب سے منعقد کیا جانے والا یہ جلسہ اُن کی بے وقت موت پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور اِس امر کا اظہار کرتا ہے کہ اُن کی ناگہانی موت ملک کی ترقی پسند قوتوں کے لیے ایک عظیم نقصان ہے۔

ڈاکٹر حسان ملکی اور بین الاقوامی مسائل کے بارے میں واضح مارکسی نقطۂ نظر رکھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ جو مارکسسٹ عملاً غربت، بھوک، بیماری، بے روز گاری جہالت اور ظلم کے چنگل میں جکڑے ہوئے عوام کو ملک کے مٹھی بھر استحصالی طبقوں سے آزادی دلانے کے لیے جد و جہد نہیں کرتا، وہ یا تو اِس فلسفے کو سمجھتا ہی نہیں یا اپنے شعور کا قرض ادا کرنے سے گریز کرتا ہے، اسی لیے وہ طبقاتی تنظیموں کے قیام کو ضروری سمجھتے تھے اور شب و روز اُن کو منظّم کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ملک سے ہر قسم کے طبقاتی اور قومی جبر و استحصال کا خاتمہ ہو جائے اور لوگ آزادانہ فضا میں سکون کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔

ڈاکٹر حسان ایک سچے انقلابی کی حیثیت سے جیے اور اپنا مقام پیدا کیا۔ مارکسی فلسفے پر پختہ ایمان نے اُن کو ایک جری، بے لاگ اور غیر مصلحت پسند بنا دیا تھا۔ کالج میں سیاسیات پڑھانے سے لے کر ادبی اور سیاسی محفلوں تک اُنھوں نے مزدور طبقے کے مفاد کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھا۔ مارکسی فلسفے نے اُنھیں ابہام پرستی اور قوم پرستانہ تنگ نظری سے پاک رکھا۔

ڈاکٹر م۔ ر۔ حسان غیر فرقہ وارانہ، سائنسی اور عقلی بنیادوں پر ایک غیر طبقاتی سماج کے قیام کے لیے آخری دم تک جد و جہد کرتے رہے، کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ عرش پر جنت کی تلاش سے بہتر یہ ہے کہ زمین ہی کو جنت بنایا جائے۔ اِس آدرش کے حصول کے لیے اُنھیں جیل سمیت مختلف مشکل مرحلوں سے بھی گزرنا پڑا اور اُنھوں نے ہر مشکل کا بڑی پامردی اور خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔

ڈاکٹر حسان کی سوچ اور عمل نے مختلف طبقوں کے بہت سے افراد کو متاثر کیا اور وہ لوگ بھی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ استحصال سے پاک سماج کے قیام کی جد و جہد میں دل و جان سے شریک ہو گئے۔ مزدوروں کو طبقاتی شعور سے مسلح کر کے اُن کو منظّم کرنا ہو یا کسانوں کی کانفرنس کے لیے چندہ جمع کرنا، ادیبوں اور دانش وروں کو ترقی پسند سوچ کی بنیاد پر منظّم کرنا ہو یا طلبا اور خواتین کو اپنے حقوق کے حصول کے لیے صحیح راستہ دکھانا، یا مظلوم قومیّتوں کے حقوق کا مسئلہ ـــــ ڈاکٹر صاحب ایک با عمل مارکسی کی طرح ہر وقت مصروفِ جد و جہد نظر آتے تھے''۔

ڈاکٹر حسان بائیں بازو کے حلقوں میں ملکی سطح پر جانی پہچانی ایک ایسی شخصیت تھے جس کے لیے دلوں میں بڑی عزت و توقیر تھی اور اُن کے گہرے مراسم اور رابطے تھے، خصوصیت کے ساتھ جناب فیض احمد فیض کے ساتھ اُن کی قربت کی نوعیت غیر معمولی تھی۔ وہ عبداللہ ہارون کالج لیاری کراچی میں وائس پرنسپل کی حیثیت سے اُن کے معتمدِ خاص اور رفیقِ کار تھے اور اِن دونوں کے درمیان قربتوں کے رشتوں کی اساس مارکسی نظریے اور آدرش پر استوار تھی:

وہ تو وہ ہیں، تمھیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو
(فیض)

فیض صاحب کے محبوبِ نظر سے ڈاکٹر حسان کو بھی وہی والہانہ عشق اور محبت تھی جس سے جناب فیض کی شاعری کسبِ نور کر کے دلوں کو گرماتی اور ذہنوں کو منور کرتی رہی۔ جناب فیض کا محبوبِ نظر ظاہر ہے کہ اُن کا آدرش ہے۔ یہ آدرش اپنے وطن کے گلی کوچوں سے نکل کر پوری دھرتی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، جس آدرش نے وطن دوستی اور انسانیت دوستی کے دو دھاروں کو ایک کر کے آفاقیت کے ایک سیلِ رواں کو جنم دیا ہے۔ یہ آدرش انسانیت سے بے پناہ پیار کا آدرش ہے، مظلوم طبقات کے کاز کی حمایت کا آدرش ہے، یہ آدرش آزادی، خوش حالی اور حقیقی بھائی چارگی کی منزل کے حصول کے لیے جد و جہد کا آدرش ہے۔

ڈاکٹر حسان کی فکر و دانش بنی نوعِ انسان سے اُن کی والہانہ چاہت اور مظلوم طبقات کے کاز سے محبت اور کمٹمنٹ سے عبارت ہے۔ وہ ایک نظریاتی انسان کی حیثیت سے ساری زندگی جد و جہد میں مصروف رہے۔ اُن کا نظریۂ حیات معاشرے کو ظلم و ستم، جبر و استحصال، غربت و افلاس،

جہل وتوہمات اور اَن گنت سماجی ناانصافیوں کی پیدا کردہ بد صورتیوں سے پاک کر کے ایک معاشرے کی تعمیرِ نو اور تشکیل وتخلیق ہے جہاں حُسن اور محبت کی حکمرانی ہو، جہاں انسان عدمِ تحفظ کے احساس سے بے نیاز ہو، جہاں منافقت، بے ضمیری اور نفرتوں کی جگہ سچائی اور خلوص کی عمل داری ہو، جہاں جہل کا پرچم سرنگوں اور علم وحکمت کا علم بلند ہو، جہاں تاریکی وظلمت کی طاقتیں ذلیل و رسوا ہوں اور نور ونکہت سرخ رو وسرفراز ہو۔ وہ معاشرے کو ایک ایسے انقلاب سے ہم کنار دیکھنے کے خواہاں تھے جو معاشرے کے تہذیبی ورثے کو شرفِ انسانیت سے مالا مال کر دے اور اُس کی بنیادوں کو لوٹ کھسوٹ، جھوٹ، افلاس، بے ضمیری، ریا کاری اور ہر قسم کے استحصال سے پاک کر دے، انسان کو آزادی اور خوش حالی کی طمانیت میسر ہو اور اُن زنجیروں کو پاش پاش کر دے جن میں انسان صدیوں سے جکڑا ہوا ہے اور جو اُس کی بے پایاں تخلیقی صلاحیتوں کے فروغ میں حائل ہیں۔ وہ انقلاب جو انسانی معاشرے میں حقیقی مساوات اور بھائی چارگی کا امین ہے، وہ انقلاب جس کی تکمیل کے بعد یہ دھرتی امن وآشتی کا ایسا گہوارہ بن جائے گی جہاں جنگ کی ہول ناکیوں کا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہے گا اور انسانی تہذیب کا مستقبل ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔

ڈاکٹر حسان محنت کشوں اور تمام دیگر مظلوم طبقوں کے کاز کے لیے عملی جدوجہد کرنے والے دانش ور اور رہ نما تھے۔ مظلوم انسانیت کا دُکھ سُکھ اُن کا دُکھ سُکھ تھا۔ ڈاکٹر موصوف ایک بڑی ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اور اُن کی جدوجہد کے مختلف پہلو اور جہات ہیں۔ اُن کے علم وفضل سے ہم جیسے بے شمار لوگوں نے روشنی حاصل کی ہے۔ قومی اور عالمی مسائل پر اُن کا جتنا گہرا مطالعہ تھا، اِس کا دعویٰ بہت کم لوگ کر سکتے تھے۔ ادب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ہمیں یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر حسان کا ادب کا مطالعہ بھی کچھ کم وقیع اور گراں قدر نہ تھا۔ ادبی مسائل پر اُن کی گرفت بڑی مضبوط تھی اور اُن پر اُن کی رائے بڑی ٹھوس، واضح اور دو ٹوک ہوا کرتی تھی۔ عوامی ادبی انجمن کی نشستوں میں اُن کی عالمانہ گفتگو، اُن کے ادبی شعور کی پختگی، گہرائی اور گیرائی کی مظہر ہوا کرتی تھی۔ اُن کی یہ گفتگو ادب کے ایک شیدائی کی نہیں بلکہ ادب کے ایک مستند اور بالغ النظر استاد کی گفتگو ہوا کرتی تھی۔

عوامی ادبی انجمن کا قیام اور اُس کا باقاعدگی سے سرگرمِ عمل رہنا، ڈاکٹر حسان کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ عوامی ادبی انجمن جو ہمارے ملک کے مخصوص حالات میں انجمنِ ترقی پسند مصنّفین کے احیا کے طور پر قائم کی گئی اور جو بجا طور پر پاکستان میں انجمنِ ترقی پسند مصنّفین کی جانشیں انجمن ہونے کا اعزاز رکھتی ہے، ہمارے نزدیک ڈاکٹر حسان اِس کے سب سے بڑے بانی اور روحِ رواں تھے۔ عوامی ادبی انجمن کے قیام کا اصولی فیصلہ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے ابتدائی حصے میں لاڑکانہ کے قریب باکرانی روڈ پر واقع ایک فارم ہاؤس میں خفیہ اجلاس منعقد کیا گیا تھا جس کی صدارت جناب فیض احمد فیض نے کی تھی اور شرکائے اجلاس میں اجمل خٹک، حبیب جالبؔ، شمشیرالحیدری حسن حمیدی، شوکت عابدی، تاج ابڑو، کامریڈ جمال الدین بخاری، ڈاکٹر حسان اور راقم تھے اور اُس اجلاس کا میزبان اور محرک بھی راقم تھا۔ انجمنِ ترقی پسند مصنّفین کے غیر قانونی قرار دیے جانے کو ایک عشرہ گزر رہا تھا، چنانچہ ۱۹۶۰ء سے انجمن کی کسی دوسرے نام سے بحالی کا خیال زیرِ غور تھا، سو اِس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں ابتدائی اقدام کے لیے لاڑکانہ کے ایک کالج کے سالانہ بین اللسانی مشاعرے کے موقع سے فائدہ اٹھایا گیا۔ مذکورہ مشاعرے کا ناظم راقم تھا اِس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے میں کئی سال لگے۔ ڈاکٹر حسان آغازِ سفر سے پیش پیش رہے۔ آخرِ کار ۱۹۶۷ء میں یہ تنظیم 'عوامی ادبی انجمن' کے نام سے قائم ہوئی اور اِس کا منشور ایک کتابچے کی صورت میں چھ زبانوں، یعنی اردو، بنگالی، بلوچی، پشتو، پنجابی اور سندھی میں ڈاکٹر حسان نے شائع کیا جس پر مذکورہ زبانوں کے حسبِ ذیل چودہ صاحبانِ قلم نے دستخط ثبت کیے:

جوشؔ ملیح آبادی، فیض احمد فیضؔ، شیخ ایازؔ، اجمل خٹک، گل خاں نصیر، فارغ بخاری سیف الرحمان مزاری، نورالدین سرکی، جوہر میر، رضا ہمدانی، تنویر عباسی، حسن حمیدی، ڈاکٹر حسان اور مسلم شمیمؔ۔ ۱۹۶۷ء میں عوامی ادبی انجمن کے قیام کے وقت سے زندگی کے آخری لمحے تک ڈاکٹر حسان نے اِس کو اپنی جان کی طرح عزیز رکھا، اِس کے وقار اور ساکھ پر کوئی حرف آنے نہیں دیا۔ اِس پر کیے گئے حملوں اور یلغاروں کا بڑی جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا اور اِس کی حیثیت تسلیم کروائی۔ عوامی ادبی انجمن کے فورم سے ڈاکٹر حسان ادبی رجحانات کو صحت مند خطوط پر پروان چڑھانے کے لیے بڑی سرگرمی سے پیش پیش رہے، جدیدیت کے منفی رجحانات کی موثر انداز سے مخالفت کر کے ادب کے پودے کو اِس کے زہریلے اثرات سے محفوظ رکھنے میں رہ نمایانہ خدمات انجام دیں۔ ادب کے ترقی پسند نظریات کی پُرزور وکالت کرنے میں اُنھوں نے کبھی کسی مصلحت کوشی کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا۔ وہ ادب کے سماجی کردار کو ہمیشہ اجاگر کرتے رہے ادب کو زندگی کا ترجمان اور خادم ہونے کے منصب سے ہٹانے اور روگردانی کرانے والوں کو اُنھوں نے اپنی تیز وتند تنقید کا ہدف بنایا۔ ادب اور زندگی کے باہمی رشتوں کو استوار اور مستحکم تر کرنے میں وہ نوجوان ادیبوں کے لیے شجرِ سایہ دار بنے رہے۔ وہ کڑے سے کڑے وقت اور انتہائی ناسازگار حالات میں بھی کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہوئے اور نہ اپنے مشن کو کبھی پسِ پشت ڈالا۔ اُن کی زندگی رجائیت کی روشنی سے منور تھی اور وہ یہ روشنی دوسروں میں تقسیم کر کے ایک لازوال طمانیت محسوس کرتے تھے۔ اپنے ساتھیوں کے لیے وہ رجائیت کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھے۔ عوامی ادبی انجمن کا منشور چھ صفحات پر مشتمل ایک جامع دستاویز ہے۔ ادب اور ادبی نظریات کے علاوہ اِس دستاویز میں ملک میں زبان کے مسئلے پر سائنسی فکر کو بروئے کار لا کر اردو کو ملک کی مشترکہ زبان یا رابطے کی زبان کا منصب دیا گیا اور دیگر زبانوں کو قومی زبان کہا گیا۔ اردو زبان کے حوالے سے یہ

نقطۂ نظر ڈاکٹر حسان نے اپنے ایک مقالے بعنوان 'پاکستان میں اردو کا مسئلہ' میں تفصیل سے پیش کیا تھا۔ اِس مسئلے کو وسیع تر تناظر میں ڈاکٹر حسان نے اپنے ایک دوسرے مقالے بعنوان 'قومیت کے مسئلے پر بحث کی ضرورت' میں پیش کیا۔ مذکورہ دونوں مقالے دو کتابچوں کی صورت میں ''عوامی فکری محاذ'' کے زیرِ اہتمام شائع کیے گئے۔ ''عوامی فکری محاذ'' کا ادارہ ڈاکٹر حسان کی زندگی میں اُن کی رہ نمائی میں قائم کیا گیا تھا، فصیح الدین سالار مرحوم اُس کے روحِ رواں تھے اِس ادارے کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر حسان کا انگریزی زبان میں پی ایچ۔ڈی کا مقالہ بھی کتابی صورت میں شائع کیا گیا تھا جس کا نام 'INDIAN POLITICS AND THE BRITISH RIGHT 1914 - 1922' ہے جو ۲۹۰ صفحات پر مبنی ہے۔ یہ کتاب تحریکِ آزادی کے ارتقائی سفر کے مطالعے میں قارئین کے لیے گائڈ کا درجہ رکھتی ہے جو مارکسی نقطۂ نظر، یعنی تاریخی مادیت کی روشنی میں تحریر کی گئی ہے۔

ڈاکٹر حسان مرحوم نے اپنی ادارت میں شائع ہوئے والے ہفت روزہ جریدے 'عوامی آواز' کے ذریعے رجعت پرستی، آمریت اور فسطائیت کے خلاف جو آواز بلند کی تھی، اُس کی صدائے بازگشت جمہوریت پسند اور ترقی پسند حلقوں میں عرصۂ دراز تک سنی جاتی رہی۔ اِس جریدے کے ذریعے جہاں اُنھوں نے ایک طرف مقامی رجعت پرست اور جمہوریت دشمن قوتوں پر ضربِ کاری لگائی وہاں دوسری طرف بین الاقوامی سامراج اور جدید نو آبادیاتی نظام کے سرپرستوں اور اُن کے کاسہ لیسوں کے مکروہ چہروں کو بڑی بے باکی کے ساتھ بے نقاب کیا۔ اپنے اِس منصب کے فرائض کی ادائیگی میں اُن کو قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ اِن مرحلوں سے بڑی پامردی اور خندہ پیشانی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے اور سرخ رو رہے۔ اُنھوں نے جمہوری اقدار کے فروغ کے لیے کسی قربانی سے گریز نہیں کیا اور ترقی پسندیت، خرد افروزی اور انسانیت دوستی کی ترویج اور پرچار کی راہ میں حائل ہونے والی بڑی سے بڑی رکاوٹ کی پروا نہیں کی اور اپنے کمٹمنٹ پر پوری شدت کے ساتھ قائم رہے۔

ڈاکٹر حسان کی بے وقت اور اچانک موت ہمارے خیال میں اِس ملک میں پائی جانے والی گھٹن اور فسطائیت کی دین تھی۔ ڈاکٹر حسان جیسا فرد اپنی روشنیِ طبع کے باوصف ایک کربِ مسلسل میں مبتلا رہنے پر مجبور تھا۔ یہ کربِ مسلسل آدمی کو مرنے سے پہلے کتنی بار موت سے پنجہ آزمائی کے مرحلے سے دوچار کرتا ہے، اِس کا اندازہ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر م۔ ر۔حسان کی موت ترقی پسند حلقوں کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے، مگر اُن کی جسمانی موت اُن کی فکر، اُن کے نظریے، اُن کی تحریک اور اُن کے کارناموں کی جلو میں ایک نئی زندگی کا روپ دھار لے گی:

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو ! پندگرو ! راہ گزر تو دیکھو۔
(فیض)

ڈاکٹر حسان جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، وہ ایک ایسے دانش وراور نظریہ داں تھے جنھوں نے اپنے نظریے اور آدرش کی کارفرمائی کا عملی روپ دیکھنے کے لیے جدو جہد میں ساری زندگی بسر کی کیونکہ وہ کارل مارکس کے اِس قول اور رائے کی قدر و قیمت اور سچائی سے آگاہ تھے کہ فلسفی دنیا کی تشریح کرتے ہیں جبکہ صحیح کام تو اُسے بدلنا ہے، سو وہ فکر و دانش کے پیکر ہونے کے ساتھ جہدِ مسلسل کی تصویر تھے یعنی عالمِ باعمل تھے۔ اُن کے دائرۂ کار کا نقطۂ آغاز خود اُن کا اپنا گھر تھا، یعنی وہ CHARITY BEGINS AT HOME کے قائل تھے، سو اُن کا پورا خانوادہ اُن کا ہم نوا اور ہم نظریہ تھا اور اُن سب کا عملی تعاون ڈاکٹر حسان کو حاصل تھا، خصوصیت کے ساتھ اُن کے دو بھائی ڈاکٹر محبوب اور فصیح الدین سالار اور اُن کی چھوٹی بہن اقبال سلطانہ ترقی پسند تحریکوں اور بائیں بازو کی سیاست کے علم برداروں کی صفِ اول میں شامل رہی ہیں۔ خواتین کے محاذ کی ایک اہم رہ نما کی حیثیت سے وہ جانی پہچانی جاتی ہیں اور انجمنِ جمہوریت پسند خواتین سے وابستگی اور اُن کی کارگزاریاں قابلِ فخر اور لائقِ تقلید کہلانے کا استحقاق رکھتی ہیں۔ واضح رہے کہ انجمنِ جمہوریت پسند خواتین کی بانی محترمہ طاہرہ مظہر علی خاں نے ۱۹۵۰ء میں لاہور میں اِس کی بنیاد رکھی تھی۔ ۱۹۶۹ء میں اِس نے کراچی میں اپنی سرگرمی شروع کی تھی۔ محترمہ اقبال سلطانہ ورکرز پارٹی پاکستان کی سنٹرل کمیٹی کی رکن اور خواتین ونگ کی انچارج ہیں۔

ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن قیامِ پاکستان کے بعد طلبا کی ایک ایسی تنظیم کے طور پر ابھری تھی جو بائیں بازو کی سیاست اور جدو جہد کی قیادت و سیادت کا تفخر رکھتی ہے، جس کے رہ نماؤں میں ڈاکٹر شیر افضل ملک، ڈاکٹر سرور، ڈاکٹر رحمان علی ہاشمی اور متعدد شخصیات کے نام شامل ہیں جن میں سے ایک نام ڈاکٹر محبوب کا بھی ہے۔ فصیح الدین سالار صحافیوں کی تحریک کے بے حد فعال قائدین میں شامل تھے۔ مارکسی فلسفے کی روشنی سے اُن کی فکر و نظر کی دنیا بھی آباد تھی۔

ڈاکٹر حسان کا ایک بڑا عالمانہ کام کمیونسٹ مینی فسٹو کا اردو ترجمہ کرنا ہے۔ اُس کے متن کی تشریح کے حوالے سے اُنھوں نے حاشیے بھی لکھے جس کو اُن کی وفات کے بعد فصیح الدین سالار نے شائع کیا اور اُس کے مدون کی حیثیت سے ایک جامع پیش لفظ شاملِ اشاعت کیا اور کچھ حاشیے بھی لکھ کر متن کی تشریح کا کام مکمل کیا۔ اِسے فصیح الدین سالار کی بڑی کارگزاری قرار دی جانا چاہیے جہاں تک ڈاکٹر حسان کے اشتمالی منشور یعنی ترجمے کا تعلق ہے تو اِس باب میں ڈاکٹر حسان کا نقطۂ نظر یہ ہے جس کا اظہار اُنھوں نے متعدد بار کی صحبتوں میں مجھ سے دورانِ گفتگو کیا تھا کہ وہ اُن ترجموں سے جو اُس وقت تک چھپ کر کئی نسلوں سے تعلق رکھنے والے قارئین کے زیرِ مطالعہ آ چکے تھے، وہ مطمئن نہیں تھے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کا یہ شاہکار جس نظریاتی اہمیت کا حامل تھا، اُس سے ایک دنیا آگاہ اور مستفید ہو چکی ہے، وہ اپنے طرزِ بیان و زباں اور انشاپردازی کے حوالے سے بھی ایک شاہکار

تصنیف ہے۔ وہ کہتے تھے کہ مذکورہ ترجموں میں مفہوم کی ادائیگی ہوگئی ہے، مگر وہ کاٹ (SHARPNESS) جو اِس تصنیف کا وصفِ خاص ہے، وہ ترجمے میں کہیں نظر نہیں آتی۔ اِس اعتبار سے کمیونسٹ مینی فسٹو کے نفسِ مضمون کی توانائی اور چابک دستی ترجمہ پڑھنے والوں کو میسر نہیں آتی، چنانچہ ڈاکٹر حسان کمیونسٹ مینی فسٹو کا ترجمہ کرتے وقت اپنی توجہ خاص مرکوز رکھتے اور وہ ایک ایک جملے کا ترجمہ کرتے وقت غور وخوض میں پہروں وقت صرف کرتے تھے چنانچہ مختصر تصنیف کا ترجمہ کرنے میں اُن کے متعدد مہینے صرف ہوئے ڈاکٹر حسان ویسے بھی طبعاً PERFECTIONIST تھے۔ اُن کی ایک اور اہم کتاب جو E. H. CAAR کی بین الاقوامی امور سے متعلق تھی اور جو کراچی یونیورسٹی کے نصاب میں شامل تھی، اُس کا ترجمہ بھی عالمانہ ادراک وشعور کا حامل تھا۔ غرض یہ کہ ڈاکٹر حسان ایک بڑے دانش ور ہونے کے ساتھ ایک بڑے محقق اور اسکالر بھی تھے ہفت روزہ 'عوامی آواز' جس کے وہ مدیرِ اعلیٰ تھے، اُس کے اداریے اُن کی مذکورہ فکر ودانش کی گیرائی اور گہرائی کے حامل ہوتے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان جس کے وہ عرصۂ دراز سے رکن رہے تھے، اُس کی وقت گزرنے کے ساتھ تقسیم در تقسیم ہوتی رہی، چنانچہ اِس صورتِ حال سے بددل ہوکر اِس سے تنظیمی طور پر علیحدہ ہوگئے، مگر اِس سے غیر معمولی نظریاتی وابستگی نے اُنھیں ۱۹۸۰ء میں کمیونسٹ لیگ کی تشکیل کی راہ دکھائی اور اُنھوں نے اپنا مشن اور عملی جدوجہد کا سلسلہ جاری رکھا وہ خود کمیونسٹ لیگ کے سکریٹری جنرل منتخب ہوئے اور اُس کی بارہ رکنی مرکزی کمیٹی میں اُن کے علاوہ یہ اشخاص اُن کے ساتھی بنے: کامریڈ لال بخش رند، اختر حُسین، فصیح الدین سالار، بابر ایاز عنایت کاشمیری، نجمہ بابر اقبال سلطانہ، محمود عزیز کرد، نور محمد اچکزئی اور ڈاکٹر شیر افضل ملک کمیونسٹ لیگ بعد میں پاکستان ورکرز پارٹی میں مدغم ہوگئی۔

ذکر ڈاکٹر حسان کے خانوادے کا ہے جس کے تمام ارکان اُن کے نظریے سے متفق اور اُن کے آدرش کو روبعمل لانے کی جد وجہد میں حسبِ حالات اُن کے شریکِ سفر تھے۔ اِس خانوادے سے وابستگی ایک ایسے شخص کی پیدا ہوئی جو ڈاکٹر حسان کے نظریاتی شاگرد کہے جاسکتے ہیں، وہ ہیں معروف دانش ور وکیل اور سیاست کار جناب اختر حسین ایڈووکیٹ جو پہلے اِس خانوادے سے نظریاتی طور پر وابستہ ہوئے اور بعد میں ڈاکٹر حسان کی چھوٹی بہن جن کا ذکرِ خیر پہلے آچکا ہے یعنی اقبال سلطانہ سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ یہ دونوں جیون ساتھی بھی ہیں اور نظریاتی طور پر ایک دوسرے کے ہم نفس وہم قدم بھی۔ اختر حُسین ایڈووکیٹ کا آبائی گاؤں ضلع جہلم پنجاب میں واقع ہے، مگر اُن کے شعور کا تمام تر سفر شہرِ کراچی میں ۱۹۶۳ء سے شروع ہوا۔ اختر حُسین اپنے مارکسی نظریات کے حوالے سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اُن سے میرا عرصۂ شناسائی وآشنائی چار عشروں پر محیط ہے۔ ہم ایک دوسرے کے نظریاتی ساتھی ہیں۔ وہ وکلا برادری کی ایک محترم اور معتبر شخصیت ہیں اور بار کی سیاست میں بے حد فعال ہیں۔ وہ ۱۹۸۴-۸۵ء میں کراچی بار ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ ۲۰۰۵ء میں سندھ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر منتخب ہوئے سندھ بار کونسل کے رکن اور پھر اُس کے وائس چیرمین منتخب ہوئے۔ اِس سال ۲۰۱۱ء میں پاکستان بار کونسل کے رکن منتخب ہوئے اور وہ ۲۰۱۵ء تک اِس منصب پر فائز رہیں گے۔ اِن حوالوں سے اختر حُسین کی مقبولیت اور وکلا برادری میں اُن کے مقام ومنصب کا اندازہ ہوتا ہے۔ اختر حسین کی ادب کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی بھی کئی عشروں پر محیط ہے اور اُن کی بائیں بازو کی سیاست کی زندگی بھی چار عشروں پر محیط ہے۔ اِس وقت اختر حسین ملک کی ایک اہم سیاسی پارٹی جس کے صدر جناب عابد حسن منٹو ہیں، یعنی ورکرز پارٹی پاکستان کے جنرل سکریٹری کے منصب پر فائز ہیں گویا اختر حسین، ڈاکٹر حسان کے نظریاتی وارث ہیں۔ یہ سب کچھ میرے نزدیک ڈاکٹر حسان کی قربتوں کی دین اور عطا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ''ایں خانہ تمام آفتاب است''۔

بقیہ سرائیکی وہزارہ صوبے کا مطالبہ

پہلے تو تاریخ کا ریکارڈ درست رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پشتون خواہ کی تاریخ کا مختصر جائیزہ لیں ۔انگریز نے غیر منقسم ہندوستان میں جس شمالی مغربی علاقے کو شمال مغربی سرحدی صوبے کا نام دیا تھا پاکستان کے قیام کے بعد وہاں کے عوام کا مسلسل مطالبہ رہا ہے کہ فاٹا اور پاٹا یعنی منسلکہ قبائلی علاقہ جات کو صوبے میں شامل کیا جائے اور صوبے کا نام پشتونوں کی اپنی شناخت کے حوالے سے ہونا چاہئے جیسا کہ پنجابیوں کا دیس پنجاب، سندھیوں کا سندھ بلوچوں کا بلوچستان ، بنگالیوں کا بنگال اس طرح اس صوبے کا نام پشتونستان یا پشتونوں کی قومی شناخت سے ہونا چاہئے لیکن ہمارے حکمران طبقے اور خاص کر ہزارہ سے مسلم لیگی راہنما یا مرکزیت کا ذہن رکھنے والے اس کے سخت مخالف تھے حتیٰ کہ پشتونخواہ کے عوام کی عمومی رائے کے مطابق اٹھارویں آئینی ترمیم کے تحت ان کے صوبے کا نام خیبر پختونخواہ رکھا گیا تو فوراً اس کے ردِعمل کے طور پر ہزارہ صوبے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہزارہ کے لوگ پشتونوں سے اور پشتونوں کی شناخت سے اپنے کو الگ سمجھتے ہیں۔ ہزارہ کے لوگوں کو بھی اپنی زبان وتہذیب وثقافت کے تحفظ اور شناخت کا حق ہے اگر وہ اپنی قومیت کی بنیاد پر اپنا الگ صوبہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو جبر سے کسی علاقے یا قومی اکائی کو دوسرے صوبے میں شامل نہیں رکھا جاسکتا۔ البتہ اسے بھی جمہوری انداز میں حل ہونا چاہئے ۔مسئلے کے اس پہلو پر بھی غور کی ضرورت ہے کہ بعض صوبوں میں ایک سے زائد زبانیں بولی جاتی ہے ان کی زبانوں کا تحفظ، تقدس، اور ترقی ہونی چاہئے ، اگر ایک صوبے کے عوام قومی اکائی وقومی شناخت کی بنیاد پر الگ صوبائی حیثیت قائم کرنا چاہئے ہیں تو وہ مسئلہ عوام کی جمہوری رائے کے تحت حل ہونا چاہئے۔ پاکستان میں زبانوں کا مسئلہ ایک الگ موضوع ہے اور اس پر ایک علیحدہ مضمون تحریر کرنے کی ضرورت ہے۔

فیض کے اسلوب کے استعاری عناصر

ڈاکٹر ضیاء الحسن

فیض احمد فیض کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ''ان کی شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔بعض نقادوں نے اسے رومانیت سے گریز اور ترقی پسند حقیقت نگاری کی طرف سفر کا آغاز قرار دیا ہے، بعض دوسرے نقادوں نے اسے رومانوی حقیقت پسندی یا رومانویت اور ترقی پسندی کا امتزاج قرار دیا ہے۔فتح محمد ملک نے اپنے مضمون ''فیض کی دو آوازیں''مشمولہ ''تعصّبات''میں اسے فیض کے فطری رنگ شعر اور اختیاری حقیقت پسندی کی کشمکش بنا دیا ہے۔وہ طنزیہ لہجے میں کہتے ہیں کہ فیض ترقی پسند حقیقت نگاری کی طرف صاحبزادہ محمود الظفر کے ہاتھ پر''مشرف بہ اشتراکیت'' ہونے کے بعد راغب ہوئے ورنہ ان کی اصل شاعری رومانویت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے، جہاں ان کے شعری کمالات کھل کر اپنا اظہار کرتے ہیں۔فیض جیسے اہم شاعر کے بارے میں ایسی متضاد آرا کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے کیونکہ جو شخص اپنے کسی کمال کے باعث لوگوں کی توجہ کا مستحق ٹھہرتا ہے،اس کے حوالے سے یہ اختلاف رائے ضرور سامنے آتا ہے۔سلیم احمد نے''نئی نظم اور پورا آدمی''میں اس نظم کے بارے میں تضحیکی انداز اپنایا ہے۔لکھتے ہیں:۔

''فیض کی شاعری کا''میں''محبوبہ کو یہ مژدہ سناتا ہے کہ وہ دردمندوں اور غریبوں کی حمایت کے کام میں بہت مصروف ہے،اس لئے ان سے پہلی سی محبت نہیں کرسکتا ہے اور آپ یہ نہ سمجھے کہ یہ اس نے کسی شدید جذباتی کرب کے عالم میں سنایا ہے بلکہ اس طرح جیسے کوئی کسی کو ملازمت میں تبادلے کی خبر سناتا ہے اور خاص طور پر اس وقت جب تبادلہ ترقی کے ساتھ ہوا ہو۔''

طنزیہ اور تضحیکی انداز کے باوجود سلیم احمد کی رائے سے دو نتائج بہ آسانی اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ایک یہ کہ فیض نے شاعری میں''دردمندوں اور غریبوں کی حمایت کے کام'' کا آغاز کر دیا ہے۔گویا وہ بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ اس نظم میں ترقی پسند حقیقت نگاری کا اظہار ہوا ہے۔دوسرے یہ کہ یہ تبادلہ ترقی پر ہوا ہے یعنی اس نظم میں فیض کی تخلیقی شخصیت ارتقا پذیر نظر آتی ہے۔ادب کی تفہیم وتجزیہ کا کام ہر نقاد اپنے نظریہ زندگی اور نظریہ ادب کے حوالے سے کرتا ہے۔اس نظم کے حوالے سے ایک بات سب ہی نقادوں نے کی ہے کہ یہ نظم فیض کی شاعری میں نئی حقیقت نگاری کے آغاز کا اعلان ہے۔اس نئی حقیقت نگاری کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند ذہن رکھنے والے ادیبوں نے سوچ سمجھ کر ایک باقاعدہ منشور کے تحت کیا کہ ادب کا منصب زندگی کی تلخ حقیقتوں کا ادرک وتجزیہ اور ایک روشن مستقبل کے لیے تحرک پیدا کرنا ہے۔یہی شعور اس نظم میں بھی آتا ہے۔ڈاکٹر آفتاب احمد خان نے اس امتزاجی اسلوب کو اردو شاعری میں ایک نئے طرز ادا کی دریافت قرار دیا ہے۔لکھتے ہیں:

''یہ نظم واقعی ایک نئے احساس کی ترجمان ہے۔اس میں نیاز اویہ نظر ہے،جس کی مثال اردو کی جدید شاعری میں کہیں اور نہیں ملتی۔''

(فیض احمد فیض۔شاعر اور شخص)

ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے مضمون''نئے شاعر۔فیض'' میں لکھتے ہیں:''فیض نے حسن وانقلاب کو ایک دوسرے میں ایسا سمو دیا ہے کہ انقلاب میں حسن اور حسن انقلاب کا پہلو نظر آنے لگا ہے اور یہ تحلیل اردو شاعری میں بالکل نئی ہے۔''

فیض کے امتزاجی اسلوب کی حامل دیگر نظمیں پڑھ کر ڈاکٹر آفتاب احمد اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی آرا اور بھی صائب معلوم ہوتی ہیں کیونکہ اس اسلوب کی حامل ہر نظم میں انھوں نے اس نئے اسلوب کی طرح طرح سے استعمال کیا ہے۔انکی نظم''رقیب سے''بھی اس اسلوب کی حامل ہے۔فیض کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس ایک اسلوب کو متنوع طریقوں سے برتا ہے اور کہیں بھی تکرار کا احساس نہیں ہونے دیا۔''رقیب سے''میں اردو غزل کی روایتی ٹرائیکا یعنی محبوب،عاشق اور رقیب تینوں ہی کردار ہیں لیکن تینوں ہی اپنی روایتی معنویت میں اضافہ کرتے ہوئے ترقی پسند حقیقت نگاری اور طبقاتی شعور کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔فیض نے ان کے درمیان ایک نئے تعلق کو دریافت کیا ہے۔رقیب اب دشمن جان اور روسیاہ نہیں ہے بلکہ عاشق کے ساتھ احساس محبت میں شریک ہے۔یہاں حسن بھی محض احساس جمال پیدا نہیں کررہا بلکہ زندگی کے حقیقت پسند ادراک کے لیے محرک کام بھی دے رہا ہے۔نظم کا آخری حصہ طبقاتی شعور اور مجبور طبقوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف ایک احتجاجی انداز لیے ہوئے ہے۔یہ نظم پہلی نظم کی توسیع معلوم ہوتی ہے،پہلی نظم میں شاعر کہتا ہے کہ وہ معاشرے میں ہونے والی سماجی ومعاشی ناانصافی کی وجہ سے احساس جمال اور عشق کے جذبات سے بے گانہ ہوگیا ہے۔اس نظم میں حسن خود ایک محرک ہے اور احساس دردمندی پیدا کررہا ہے۔یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ ناقدین شعر نے ترقی پسند شاعری پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا ہے یہ محض نعروں اور دعوؤں کا صحافتی اظہار ہے اور شاعرانہ اسلوب اور تخلیقی عناصر سے بے بہرہ ہے لیکن جب فیض نظم کی بنت کے لیے نئے احساس شعر سے کام لیتے ہیں اور جمالیاتی حسن کے ساتھ ایک دھیمے دھیمے سلگتے انداز میں ترقی پسند فکر کے بلند و بانگ اور طوفانی موضوعات کا اظہار کرتے ہیں تو یہی نقاد ان کے خلاف بھی دلائل کا انبار لگا دیتے ہیں۔سجاد حارث نے اپنی کتاب''ادب اور ریڈیکل جدیدیت''میں اس موضوع کے حوالے سے اپنے مضمون میں اس نقطۂ نظر کے خلاف ایک وضاحتی انداز اختیار کیا ہے۔طرفہ ستم یہ کہ غیر ترقی پسند نقادوں نے تو اس کے خلاف لکھا،ترقی پسندوں

نے بھی فیض کے اس جمالیاتی اسلوب کو رد کر دیا۔ بعضوں نے تو یہ تک کہہ دیا کہ فیض چونکہ طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے ان کی شاعری میں ترقی پسندی کا اظہار کھل کر نہیں ہوا۔ ان کے اس اعتراضات کا مرکزی نقطہ یہی ہے کہ فیض نے زندگی کی کرخت حقیقتوں کو کرخت شکل میں پیش کرنے کے بجائے ریشمی پردوں میں لپیٹ دیا ہے اور زندگی کی کرختگی اور کھردرے پن کو نمایاں نہیں ہونے دیا۔ اب کیا کیا جائے کہ فیض ترقی پسندی اور نئی حقیقت نگاری سے ذہنی مطابقت رکھنے کے باوجود ایک جمالیاتی احساس رکھنے والے شاعر تھے۔ انہوں نے اس حقیقت نگاری کا اظہار بھی اپنے مخصوص مزاج اور تخلیقی شخصیت کے حوالے سے کیا ہے۔ اگرچہ ان کی شاعری کا لہجہ دھیما پن لئے ہوئے ہے لیکن وہ اسی دھیمے دھیمے انداز سے قاری کے جذبات میں اتھل پتھل پیدا کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ترقی پسند شاعری کچھ ان ہی کی ذات سے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ اس فکر کو انہوں نے جس تخلیقی توانائی سے پیش کیا ہے، کم ہی کسی ترقی پسند شاعر کو نصیب ہوا ہے۔ عوامی سطح پر بھی بلیغ استعاروں کے باوجود ان کی شاعری کو پذیرائی ملی۔ وہ نہ صرف اعلیٰ تربیت یافتہ ذوق شعر کے حامل قاری کو متاثر کرتے ہیں بلکہ عام قاری بھی ان سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میر صاحب کے اس شعر کی تفسیر معلوم ہوتی ہے:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

اس بات کو خلیل الرحمٰن اعظمی شاعر کی تخلیقی شخصیت اور سماجی شعور کی اکائی قرار دیتے ہیں، لکھتے ہیں:

''یہ شعور زندگی کے حقائق تک رسائی حاصل کر لینے یا سیاسی و سماجی مسائل کو اہم سمجھ لینے پر ہی منحصر نہیں ۔۔۔انہوں (فیض) نے اپنی شخصیت کے تمام عناصر میں ایک مرکزیت بھی پیدا کی ہے۔''

(اردو میں ترقی پسند تحریک۔ص:۱۳۸)

''چند روز میری جان'' جو پہلے ''تسلی'' کے عنوان سے شائع ہوئی، اسی امتزاجی اسلوب کی نظموں میں رجائی انداز نظر کی وجہ سے منفرد ہے۔ یہاں پہلی دفعہ شاعر ایک روشن مستقبل کی نوید سناتا ہے لیکن اس سلسلے کی نظموں میں ''موضوع سخن'' اور ''دو عشق'' اس فکر اور اسلوب کی شاہکار نظمیں ہیں۔ یہاں فیض نے رومان اور انقلاب یا عشق اور زندگی کے اس تضاد کو حل کر دیا ہے جو ان کی پہلی نظموں میں نظر آتا ہے۔ اور جن پر اعتراضات کا ایک انبار ناقدین ادب نے لگا دیا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر آفتاب احمد اور جابر علی سید نے موضوع سخن کے دونوں حصوں کے آخری شعروں کو اردو کے رومانوی شاعروں پر طنز قرار دیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ شعر فیض کے مجموعی نظریۂ شعر سے ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں۔ دو عشق اس حوالے سے زیادہ مکمل، جامع اور فکری وضاحت کی حامل ہے۔ فیض نے اس نظم میں ہچکچاہٹ کے بغیر زندگی کے جمالی اور جلالی دونوں پہلوؤں کا نہ صرف ادراک کیا ہے بلکہ انہیں زندگی کے لئے ناگزیر قرار دیا ہے۔ اس نظم میں وہ اپنے تمام معترضین سے بے پرواہ نظر آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ انہوں نے ان نکتہ چینیوں کی کج فہمی کو جان لیا ہے اور ان سے بے پرواہ ہو کر اپنی تخلیقی دنیا میں محو ہو گئے ہیں۔ رومانیت سے انقلاب اور پھر انقلاب کے جمالیاتی شعور تک فیض کے اس سفر کو پروفیسر قمر رئیس اپنے مضمون ''فیض کی غزل کا اسلوب و آہنگ'' میں یوں بیان کرتے ہیں۔

''نقش فریادی کی شاعری میں بھی فیض تنہائی اور نسوانی حسن کی پرستش کے اسی دور سے گزرے ہیں لیکن جلد ہی انہیں محسوس ہوا کہ اصل زندگی ایک کڑوا درد ہے جو گیت میں ڈھلنے سے انکار کرتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب فیض کے سماجی شعور و آگہی نے انہیں دکھی، مظلوم اور کراہتی ہوئی انسانیت سے ہمیشہ کے لئے جوڑ دیا اور اب ان کی شاعری میں فطرت کی جگہ دبے کچلے محکوم انسانوں اور ان کی بے خوابی کے خوابوں نے لے لی۔ اس طرح ان کی رومانی حسیت انقلابی احساس و فکر کے سانچے میں ڈھل گئی۔''

''دست صبا'' اور ''زندان نامہ'' کی بیشتر نظمیں ان کے اس دور کی یادگار ہیں جو انھوں نے راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں قید میں گزارا۔ ان مجموعوں میں فیض کی آواز انقلابی توانائی سے معمور ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قید نے ان کے انقلابی احساس کو مہمیز کر دیا ہو۔ وہ غالب کے اس شعر کی تصویر نظر آتے ہیں:

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

فیض نے ''دست صبا'' کے دیباچے میں لکھا تھا:

''شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے، گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے، اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر۔۔۔۔اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدوجہد چاہتے ہیں۔''

فیض نے اپنی شاعری اور زندگی میں یہ تینوں کام عملی طور پر کر دکھائے۔ فوج کی ملازمت کے دوران میں فاشسٹ قوتوں کے خلاف جنگ میں اپنا کردار ادا کیا، صحافت کے حوالے سے قلم کی لڑائی لڑی، پنڈی سازش کیس کے حوالے سے قید و بند کی صعوبتیں اٹھائی اور لوٹس (lotus) کے حوالے سے بین الاقوامی امن و سلامتی کے لیے عملی جدوجہد کی۔ ان کی زندگی کی ان سرگرمیوں کا عکس ان کی شاعری پر براہ راست دیکھا جا سکتا ہے۔ قید کے دنوں کی شاعری میں ایک باغیانہ طمطراق اور ایک انقلابی شان نظر آتی ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ ظاہری مصائب نے ان کی زندگی کی حرارت کو دوچند کر دیا ہے۔ یہ حوصلہ مندی ایک سچے انسان اور کھرے انقلابی میں ہی ہو سکتی ہے وگرنہ ہمارے ہاں تو سختی پریشانی اور پشیمانی کا شکار کر دیتی ہے۔

فیض صاحب کے شعری اسلوب اور فکر میں وقت کے ساتھ ساتھ گہرائی اور پختگی ایک ارتقائی صورت میں نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلیں، قطعات اور چھوٹی بڑی بے شمار نظمیں اس پختگی کا مظہر ہیں۔ یہاں ہم ان کی چند شاہکار نظموں کے حوالے سے بات کریں گے جن کی ستائش ہر

نقاد نے بقدر حوصلہ وظرف کی ہے۔ یہاں یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ ''دو عشق'' میں ان کے ہاں جو دوٹوک رویہ نظر آتا ہے، بعد کی شاعری میں ان کی فکر اور بھی زیادہ واضح ہو کر سامنے آئی ہے۔ ان کی نظم ''ملاقات'' کو ہر نقاد نے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ نظم اپنی بنت، امیجری اور جدید حسیت کے حوالے سے اردو کی شاہکار نظموں میں شمار ہو سکتی ہے۔ یہاں انہوں نے انقلاب کو myth بنا دیا ہے۔ نظم کے پہلے حصے میں وہ رات کی عظمت بے کرانی اور سحر کا ذکر کرتے ہیں لیکن وہ اس سحر کے اسیر نہیں ہوتے بلکہ اس کے ختم کرنے کا اسم دریافت کرتے ہیں:

ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

سجاد ظہیر نے ان چار مصرعوں کو فیض کا اپنے خاص رنگ شعر سے گریز قرار دیا ہے۔ یہ مصرعے نہ صرف یہ کہ نظم کی موضوعاتی بنت میں گریز کا کام دے رہے ہیں بلکہ فیض کے شعری تجربے میں بھی ایک اضافہ ہیں۔ فیض کی یہ نظم مایوسیوں میں امید کی کرن ہے۔ در نا امیدی بند کرتی ہے اور ایک نئے جہاں کی طرف ۔۔۔۔ ایک روشن مستقبل کی طرف در وا کرتی ہے۔ یہ نظم بجھے ہوئے دلوں میں زندگی کی حرارت پیدا کرتی ہے۔ زندگی میں آنے والی رکاوٹوں، مصیبتوں، بلاؤں اور آلام کو ایک نئی صبح کا مژدہ قرار دیتی ہے۔

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقین جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

عظیم رات سے عظیم تر صبح کا خواب ہی فیض کی شاعری کا بنیادی نقطہ ہے۔ اسی نظم کے بارے میں سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

''فیض کی نظم ملاقات مجھے پسند آئی ہے۔ اس میں علائم کی مرصع نگاری اپنے کمال کو پہنچ گئی ہے اور پہلے مصرعے سے شروع ہو کر (یہ رات اس درد کا شجر ہے) نظم کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں کے جیسے نازک پھول چاروں طرف کھلتے چلے گئے ہیں۔''

اس نظم میں جوانی کی جذباتیت اور ابتدائی انقلابی تندی کے بجائے ایک وقار اور تخلیقی رچاؤ نظر آتا ہے۔ اپنے آدرش پر یقین محکم کا ایک ایسا احساس ملتا ہے جو زندگی پر ایمان اور نظریے سے وابستگی کو مضبوط کرتا ہے۔ اب کوئی ابہام باقی نہیں رہا۔۔۔۔ کوئی بے یقینی یا نا امیدی باقی نہیں رہی۔ اس نظم کا لہجہ بھی اپنے اندر وہ تمکنت لئے ہوئے ہے جو اعلیٰ فن کا خاصا ہے۔ ملاقات کے علاوہ بھی فیض صاحب کی اور نظموں مثلاً ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے (زندان نامہ)، شام (دست تہہ سنگ) یہاں سے شہر کو دیکھو (سرِ وادیٔ سینا) اور یہ ماتم کی گھڑی ہے (میرے دل میرے مسافر) میں ان کی فن کاری کا یہی انداز ملتا ہے۔

رومانویت سے حقیقت نگاری اور حقیقت نگاری کے مختلف انکشاف کو جس طرح فیض احمد فیض نے تخلیقی رچاؤ سے پیش کیا ہے، ان کے عہد کے کم ہی شاعروں کو نصیب ہوا ہے، خاص طور پر ترقی پسند حقیقت نگاری کا جیسا تخلیقی اظہار ان کی شاعری میں ہوا ہے، دوسرے ترقی پسند شاعروں کے حصے میں نہیں آیا اس لئے نظریاتی تحرک کے حوالے سے ہم فیض کو عظیم ترقی پسند شاعر کہہ سکتے ہیں۔ اس بات کا برملا اعتراف معتدل اور متوازن فکر رکھنے والے تمام نقادوں نے کی ہے۔ ان کے فکر و فن کے ارتقائی مراحل کو حرف آخر سمجھ کر حتمی لہجے میں ان کی شاعری کو رد کرنے والے نقادوں نے کسی بھی طرح ادب کی تفہیم کا فریضہ سرانجام نہیں دیا۔ شاعر کو اس کے ارتقاء کے کسی ایک مرحلے میں نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کی تفہیم اس کی شاعری کے کلی مطالعہ سے ہی ممکن ہے وگرنہ اقبال ہوں، راشد ہوں یا فیض اپنی ابتدائی تخلیقات میں اس درجے کے شاعر نظر نہیں آتے جو ان کے فن کے کلی جائزے کے بعد متعین ہوتا ہے۔

ڈیرہ مراد جمالی کے پارٹی اجلاس میں کامریڈ محمد قاسم چنال کی خدمت کو سراہا گیا

ایوب پندرانی

ورکرز پارٹی پاکستان ڈیرہ مراد جمال کا اجلاس زیر صدارت کامریڈ ایوب پندرانی منعقد ہوا جس میں کامریڈ محمد قاسم چنال کی تیسری برسی نہایت عقیدت واحترام کے ساتھ منائی گئی۔ کامریڈ ایوب پندرانی نے کہا کہ کامریڈ محمد قاسم ایک فرد نہیں بلکہ اس علاقہ میں ایک تحریک اور انسان دوست نظریہ کا نام ہے۔ ان کی ساری زندگی محنت کشوں کی جدوجہد اور ترقی پسند فلسفہ سے پختہ وابستگی سے عبارت ہے۔ ان کا پیغام عالمی سامراج کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف مسلسل جدوجہد اور ملک میں ایک پرامن، ترقی پسند اور خوشحال معاشرہ کا قیام تھا۔ وہ تمام زندگی ساتھیوں کو یہی نصیحت کرتے رہے کہ مسائل کا حل صرف محنت کشوں کی سیاسی اور طبقاتی جدوجہد میں پنہاں ہیں اس لئے اور کوئی شاٹ کٹ نہیں۔

کامریڈ ایوب پندرانی نے اپنی گفتگو میں کارکنوں کو پارٹی پروگرام کا بغور مطالعہ کرنے کی تلقین کی اور اس پر بحث کو عوامی حلقوں تک پہنچانے کو ضروری قرار دیا تا کہ پارٹی اور پارٹی پروگرام متعارف کرایا جا سکے۔ انہوں نے کہا کہ حکمران صرف اپنے اقتدار کو بچانے میں مصروف ہیں ان کو غرض نہیں کہ ملک کے پسماندہ عوام کے دن رات کیسے گذر رہے ہیں۔ ان کرپٹ نا اہل اور عوام دشمن حکمرانوں کو بے نقاب کرنا ضروری ہے اجلاس سے عبدالرحمٰن پندرانی اور محمد رفیق پندرانی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کامریڈ قاسم چنال کو خراج تحسین پیش کیا۔

انتخابی اصلاحات کی ضرورت

مقتدا منصور

انتخابی عمل، جمہوریت اور جمہوری عمل کا ایک اہم جزو یا سیڑھی ہوتا ہے، جو عوام کو آئینی اور قانونی طریقہ سے اپنے حکمران منتخب کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اسلئے اچھی حکمرانی اور جمہوری عمل کے استحکام کیلئے ضروری ہے کہ انتخابی عمل شفاف، غیر جانبدارانہ اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ انتخابی عمل کو شفاف اور غیر جانبدار بنانے میں ایک مکمل طور پر غیر جانبدار، آزاد اور بااختیار الیکشن کمیشن کا کلیدی کردار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بااختیار اور متحرک وفعال عدلیہ اور قومی تقاضوں، مزاج اور جمہوری اقدار کا فہم وادراک رکھنے والی سیاسی جماعتوں کا بھی اہم کردار ہوتا ہے۔ اسلئے کسی معاشرے میں جمہوری نظم حکمرانی کا مطالعہ کرتے وقت وہاں مروج انتخابی طریقہ کار کا مشاہدہ پورے نظام کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

پاکستان میں جمہوری عمل کے تسلسل کے ساتھ جاری نہ رہنے کے باعث انتخابی عمل بھی متاثر ہوا۔ جمہوری عمل میں بار بار در آنے والی رکاوٹوں کا بنیادی سبب صرف وقفے وقفے سے طویل عرصہ کیلئے فوج کا ملک پر قابض ہونا ہی نہیں ہے، بلکہ سیاسی جماعتوں میں جمہوری کلچر کا فقدان اور سول سوسائٹی کا کمزور ہونا بھی ایک بہت بڑا سبب ہے۔ ان عوامل کی وجہ سے اکثر وبیشتر آئین یا تو منسوخ کئے گئے یا پھر انہیں مخصوص عرصہ کیلئے معلق کردیا گیا اور پھر اس میں غیر جمہوری طریقے سے ایسی ترامیم کی گئیں، جس سے اسکا حلیہ مسخ ہوکر رہ گیا۔ اس صورتحال کے نتیجے میں نہ صرف آئین وقانون کی بالادستی کا تصور مبہم اور غیر واضح ہوتا چلا گیا، بلکہ ریاستی ادارے مناسب احتسابی میکنزم نہ ہونے کے باعث کرپشن اور بدعنوانیوں کا شکار ہوکر فرسودگی کا شکار ہوگئے۔ ملک میں قبائلی اور برادری نظام کی جڑیں گہری ہونے اور ٹریڈ یونین اور طلبہ تنظیموں سے نئے کیڈر کی آمد رک جانے کی وجہ سے سیاسی جماعتوں کے اندر شخصیت پرستی اور موروثیت کا تصور عام ہوگیا، جس کے نتیجے میں جمہوری کلچر پنپ نہیں سکا۔ یہی وجہ ہے کہ طاقتور انتظامیہ اور فیوڈل ذہنیت کی حامل سیاسی جماعتیں جمہوری اداروں کی تشکیل اور استحکام سے خوفزدہ ہونے کی وجہ سے انتخابی اصلاحات اور ایک آزاد اور خودمختار عدلیہ اور غیر جانبدار اور بااختیار الیکشن کمیشن کی تشکیل کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔

اسوقت ملک میں جو انتخابی طریقہ کار رائج ہے، وہ ناقص، فرسودہ اور انتہائی غیر ذمہ دارانہ ہے۔ اس طریقہ کار میں نہ صرف دھاندلیوں کے وسیع امکانات موجود ہیں، بلکہ جمہوری کلچر کے فروغ میں بھی رکاوٹ بنا ہوا ہے، کیونکہ اس نظام کے تحت ایک اہل شہری اپنے محدود وسائل کے ساتھ اسمبلیوں میں پہنچنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ پاکستان میں مروج انتخابی عمل میں دھاندلیاں تین مدارج میں ہوتی ہیں، اول انتخابات سے قبل انتخابی فہرستوں کی تیاری کے دوران غلط اندراج کے ذریعہ۔ دوئم انتخابی عمل کے دوران (یعنی انتخابی مہم اور انتخابات کے روز) پولنگ اسٹیشنوں کے چناؤ اور عملے کی تقرری کے علاوہ انتخابی قواعد وضوابط کی خلاف ورزیوں اور بوگس ووٹنگ کے ذریعہ کی جاتی ہیں۔ سوئم انتخابات کے بعد نتائج کی تیاری کے دوران، جب بااثر حکومتی عہدیدار، ریاستی ایجنسیاں اور بااثر سیاسی شخصیات الیکشن کمیشن پر دباؤ ڈال کر نتائج تبدیل کراتے ہیں۔ ان تینوں قسم کی دھاندیوں میں مختلف عناصر ملوث ہوتے ہیں، مگر یہ سب کچھ الیکشن کمیشن کی کمزوری اور اس کے مکمل بااختیار نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ان دھاندیوں پر قابو پانے اور انتخابی عمل کو شفاف اور غیر جانبدار بنانے کیلئے بااختیار الیکشن کمیشن کا قیام انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ جس کیلئے ذرائع ابلاغ سمیت سول سوسائٹی کے متوشش شراکت دار کلیدی کردار کردار ادا کرسکتے ہیں۔ اگر سول سوسائٹی ایک آزاد، غیر جانبدار اور بااختیار الیکشن کمیشن قائم کروانے میں کامیاب ہوجاتی ہے، تو جمہوری عمل کے مستحکم ہونے کے امکانات بھی روشن ہوجاتے ہیں۔ دوسرا اہم مسئلہ انتخابی عمل میں ایسی تبدیلیاں ہیں، جن کے نتیجے میں اہل شہریوں کے اسمبلیوں تک پہنچنے کی راہ ہموار ہوسکے۔

ملک میں رائج انتخابی عمل میں شفافیت لانے کیلئے سب سے اہم مرحلہ انتخابی فہرستوں کی تیاری ہے۔ اگر الیکشن کمیشن اپنے طور پر انتخابی فہرستوں کی تیاری کی بجائے نادر (NADRA) کے ڈیٹا بیس سے مدد لے تو ووٹوں کے جعلی اندراج سے بڑی حد تک بچا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت کو نادرا کے نیٹ ورک کو مزید بہتر بنانا ہوگا۔ دوسرے فہرستوں میں ووٹروں کی تصاویر شامل کرنے سے جعلی ووٹنگ پر قابو پانے میں بڑی حد تک مدد مل سکتی ہے، جس کا کامیاب تجربہ بنگلہ دیش میں ہوچکا ہے۔ اس کے علاوہ الیکشن کمیشن کے بااختیار اور assertive ہونے کی صورت میں انتخابی قواعد وضوابط پر عملدرآمد نہ کرنے والے امیدواروں اور سیاسی جماعتوں کے خلاف بغیر کسی رورعایت بروقت تادیبی کاروائی کرکے انتخاباتی دھاندلیوں کے متذکرہ بالا تینوں مدارج پر قابو پاسکتا ہے۔ لیکن پاکستان کے سیاسی کلچر میں موجود فیوڈل اور برادری سسٹم کے اثرات کو انتخابی عمل میں کم کرنا الیکشن کمیشن کے دائرہ اختیار میں نہیں ہے۔ اس مقصد کیلئے انتخابی عمل میں مستقل بنیادوں پر یا کچھ عرصہ کیلئے بعض تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔

چونکہ پاکستان کا سیاسی کلچر دنیا کی دیگر جمہوریتوں سے مختلف ہے اور سیاسی جماعتیں ایسے افراد کو ٹکٹ دینے پر مجبور ہیں، جو اپنے علاقے میں اپنی فیوڈل یا برادری حیثیت کی وجہ سے خاصے طاقتور اور بااثر ہیں، یہ امیدوار کبھی اپنی دولت کے بل بوتے پر ووٹ خریدتے

ہیں تو کبھی قبائلی اور برادری کے جذبات کو برانگیختہ کر کے ووٹ حاصل کرتے ہیں اور اہلیت نہ ہونے کے باوجود اسمبلیوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ نتیجتاً متوسط اور نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے اہل افراد اپنے محدود وسائل کے باعث اسمبلیوں میں نہیں پہنچ پاتے۔ اس مسئلے سے نمٹنے کیلئے مروجہ انتخابی عمل میں اگر کچھ عرصہ کیلئے تبدیلیاں لائی جائیں، تو بہتر نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں اگر چند انتخابی مدتوں کیلئے متناسب نمائندگی کے نظام کو متعارف کرایا جائے، تو متوسط اور نچلے متوسط طبقے کے افراد کیلئے انتخابی عمل میں شرکت آسان ہوسکتی ہے۔ متناسب نمائندگی کا نظام کوئی نیا نظام نہیں ہے، بلکہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی مخصوص نشستوں (خواتین اور اقلیتوں) کے چناؤ میں استعمال ہو رہا ہے۔ اس طریقہ کار کے تحت نہ حلقوں کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی قومی اور صوبائی اسمبلی کی نشستوں میں کسی قسم کی رد و بدل کرنا ہوگی۔ صرف کسی امیدوار کا آزاد حیثیت میں انتخابات میں حصہ لینا ممکن نہیں رہے گا۔

اس طریقہ کار کے تحت ہر سیاسی جماعت کو حسب سابق انتخابی نشان الاٹ کر دیا جائے گا اور وہ جماعت انتخابات میں بالکل اسی طرح حصہ لے گی، جس طرح لیتی رہی ہے۔ ہر صوبے میں کسی جماعت کو ڈالے گئے ووٹوں کی کل ڈالے گئے ووٹوں کی شرح تناسب سے قومی اور صوبائی اسمبلی کی نشستیں تفویض ہو جائیں گی۔ لیکن سیاسی جماعتوں کو ہر صوبے سے اپنے قومی اور صوبائی اسمبلی کیلئے اراکین کی ترجیحی فہرست انتخابات سے قبل جمع کرانا ہوگی، جیسا کہ خصوصی نشستوں کے ضمن میں ہوتا ہے۔ اس طرح دو بنیادی فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اول یہ کہ سیاسی جماعتوں کے پاس کسی نااہل شخص کو محض اس کے حلقے میں بااثر ہونے کی بنیاد پر ٹکٹ دینے کا جواز ختم ہو جائے گا۔ دوئم متوسط اور نچلے متوسط طبقے کے ان اہل اور تعلیمیافتہ افراد کے اسمبلیوں میں پہنچنے کے امکانات بڑھ جائیں گے، جو وسائل کی کمی یا ٹکٹ نہ مل سکنے کے سبب اہلیت کے باوجود قومی ترقی میں اپنا کردار ادا کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اگر متناسب نمائندگی کے نظام میں بھی کوئی سیاسی جماعت مراعات یافتہ افراد یا قائدین کے عزیز و اقارب اور دوستوں کو نامزد کرتی ہے تو ان کا محاسبہ آسان ہو جائے گا۔ پاکستان جیسے معاشروں میں جہاں تعلیم کی شرح تشویشناک حد تک کم ہے اور جہاں برادری اور قبائلی نظام کی جڑیں مضبوط ہیں، متناسب نمائندگی کا نظام ملک میں جاری سیاسی Status quo کو توڑنے اور جمہوری عمل کے ثمرات معاشرے کی نچلی سطح تک پہنچانے میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔

تاریخ کے ارتقائی عمل سے یہ سبق ملتا ہے کہ کوئی نظام حرف آخر نہیں ہوتا، بلکہ معاشرے کی ضروریات نظام حکمرانی کا تعین کرتی ہیں۔ جمہوریت آج کے دور کی اہم ترین ضرورت ہے، مگر محض نام کی جمہوریت جس میں عوام کو نہ حق حکمرانی مل سکے اور نہ ان کے مسائل حل ہوسکیں، انہیں متنفر کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ عوامی سطح پر بحث و مباحثے کے ذریعہ ایسی تبدیلیاں لائی جائیں، جو عوامی مسائل کے حل کیلئے پورے سماج کو متحرک کرنے کا سبب بن سکے۔ یہ یاد رہنا چاہئے کہ کوئی نظام مثالی نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر تجویز احمقانہ ہوتی ہے۔ بلکہ اس قسم کی ذہنی مشقتوں ہی سے کسی بہتر نظام کی طرف پیش رفت ہوسکتی ہے، اسلئے مشاورت اور بحث و مباحثے سے شرمانا یا کترانا، دراصل جاری Status quo پر قناعت کرنے کے مترادف ہے، اسلئے اپنے اور اپنی آنے والی نسلوں کے بہتر مستقبل اور تحفظ کیلئے سوچ بچار اور دلیل و مکالمہ کا کلچر بہرحال جاری رہنا چاہئے۔ ہوسکتا ہے کہ ہماری اس تجویز پر غور و فکر سے قارئین اس سے بہتر تجاویز سامنے لاسکیں۔

پاکستان کسان کمیٹی کا تحصیل کبیر والا کے چکوک کا دورہ

محمد شفیع ٹانگرہ

پاکستان کسان کمیٹی کے صدر چوہدری فتح محمد، ضلع خانیوال کمیٹی کے صدر محمد شفیع خاں ٹانگرہ اور ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کمیٹی کے صدر چوہدر غلام سرور نے تحصیل کبیر والا کے چکوک 13/D فارم اور 4ایل کے نزدیکی چکوک کا دورہ کیا ان اجلاسوں میں کسانوں اور مزارعین نے بھرپور شرکت کی۔

ان اجلاسوں میں شرکاء نے جاگیرداری نظام کے خاتمے اور سرکاری زمینوں پر مزارعین اور کسانوں کو مالکانہ حقوق دلانے کے لئے منظم اور جمہوری جدوجہد کرنے کا اعلان کیا گیا۔

مختلف قراردادوں کے ذریعے مطالبہ کیا گیا کہ کھاد، بیج اور زرعی ادویات کی قیمتوں کو فوری نیچے لایا جائے تا کہ ملک کے کسان استفادہ کر سکیں۔ چک نمبر 13/D فارم کے گرلز مڈل سکول میں صرف ایک لیڈی ٹیچر تعینات ہے لہٰذا لیڈی ٹیچرز کی تعداد کو بڑھایا جائے۔ مزید یہ کہ چک میں سڑکوں اور گلیوں کو پختہ کیا جائے اور نکاس آب کا باقاعدہ بندوبست کیا جائے اجلاس میں پانچ رکنی آرگنائزنگ کمیٹی تشکیل دی گئی جو چوہدری صابر علی، چوہدری عبدالغفار، حاجی خوشی محمد، چوہدری محمد انور اور چوہدری غلام نبی پر مشتمل ہوگی۔ اجلاس سے چوہدری فتح محمد، محمد شفیع خان ٹانگرہ چوہدری غلام سرور، نعیم فتح اور نور سلطان ٹانگرہ نے خطاب کیا۔

☆☆☆☆☆

ریاست اپنے بنیادی فریضے کو پورا کرنے میں ناکام ہے، ورکرز پارٹی پاکستان

کراچی میں متعدد شہریوں کے قتل کی ذمہ دار بڑی سیاسی پارٹیاں ہیں

کراچی میں مافیا کلچر کو فروغ دینے میں اسٹیبلشمنٹ کا ہاتھ نظر آتا ہے، ترقی پسند متبادل قیادت عوام کی خوشحالی کے لیے ناگزیر ہے، عاصم سجاد

ورکرز پارٹی پاکستان نے پچھلے ایک ہفتے میں کراچی میں 100 کے قریب شہریوں کے قتل کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ملک کے سب سے بڑے شہر میں بدامنی اور تشدد کے ذمہ دار ایم کیو ایم سمیت تمام بڑی سیاسی پارٹیوں ہیں جنہوں نے 20 سال سے صرف اور صرف مفاد پرست سیاست کی ہے اور محنت کش عوام کو مافیا کے حوالے کر دیا ہے۔ پارٹی نے مزید کہا ہے کہ کراچی میں پرتشدد سیاست کو عام بنانے میں اسٹیبلشمنٹ کا واضح ہاتھ نظر آتا ہے۔

پارٹی کے مرکزی رہنما عاصم سجاد نے کہا ہے کہ جدید ریاست کا بنیادی فریضہ ہے کہ وہ شہریوں کے جان و مال کا تحفظ فراہم کرے اور پاکستانی ریاست اس بنیادی ذمہ داری سے مکمل طور پر انحراف کر چکی ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب سب سے بڑے شہر میں ایسے حالات ہونگے تو ملک کے دیگر علاقوں میں کیا ہو رہا ہوگا۔ عاصم سجاد نے بلوچستان کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ ایک پورا صوبہ ریاستی جبر کی وجہ سے جل رہا ہے جبکہ ردعمل میں جو پرتشدد سیاست ہو رہی ہے اس کو بیرونی ہاتھ کہا جا رہا ہے جس کی وجہ سے حالات اور زیادہ سنگین ہوتے جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کراچی میں لینڈ مافیا اب اتنا مضبوط ہو گیا ہے کہ تمام بڑی پارٹیوں کی کوشش ہے کہ اس مافیا کے کسی بھی حصے کے ساتھ تعلقات قائم کئے جائیں اور کوئی بھی پارٹی عوام کی خاطر اس مافیہ کو چیلنج کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ عاصم سجاد نے کہا کہ اب ایم کیو ایم حزب اختلاف میں شامل ہونے کا چرچا کر رہی ہے حالانکہ پچھلے 20 سال سے اسی جماعت نے کراچی میں حکومت کی ہے اور اب نام نہاد سوگ منانے کے بجائے اس شہر کو جہنم بنانے میں اپنا کردار تسلیم کرنا چاہیے۔

خانیوال میں پارٹی اجلاس کی رپورٹ

ورکرز پارٹی پاکستان ضلع خانیوال کا ماہانہ اجلاس 27 جون کو رہائش گاہ اسلم پرویز چوہان ضلعی صدر ضلع خانیوال منعقد ہوا جس کی صدارت بلال خان ایڈووکیٹ نے کی۔ مہمان خصوصی جناب ظہور خان مرکزی راہنماء ورکرز پارٹی پاکستان تھے۔

اجلاس میں تنظیمی صورت حال ضلع خانیوال اگست 2011 میں منعقد ہونے والے سالانہ ضلعی انتخابات، بجٹ 2012-2011، کارکنان کے سٹڈی سرکل، پارٹی کے سیاسی معاملات پر کارکنان نے اظہار خیال کیا۔ اس کے علاوہ حال ہی میں سامراجی کاروائیوں کے بارے میں پارٹی میں پائے جانے والی مختلف آراء پر بحث و مباحثہ ہوا۔

کارکنان نے مطالبہ کیا کہ 17 جولائی کو ہونے والی پنجاب کمیٹی کی میٹنگ میں سامراجی کاروائیوں کے بارے میں بحث پر ورکرز پارٹی پاکستان کا موقف واضح کیا جائے تا کہ کارکنان کنفیوژن کا شکار نہ ہوں۔ اجلاس میں بجٹ 2012-2011 کو مایوس کن اور عوام دشمن قرار کر مسترد کر دیا گیا۔

ضلعی انتخابات ماہ اگست 2011 میں ہونگے جن کے بارے میں تفصیلی پروگرام 24 جولائی 2011 کی ماہانہ میٹنگ میں تشکیل دیا جائے گا۔ اجلاس میں زور دیا گیا کہ پارٹی کے ماہانہ فنڈ کو باقاعدہ کر کے مالی مسائل پر قابو پایا جائے تا کہ پارٹی معاملات احسن انداز میں چل سکیں۔ اجلاس میں نیسلے ورکرز یونین کی مکمل حمایت کا اعلان کیا گیا اور اس عزم کا اعادہ کیا گیا کہ ورکرز پارٹی پاکستان نیسلے کے مزدوروں کی جدوجہد میں مزدور اتحاد کی مکمل حمایت کرتی ہے اور انتظامیہ کے مزدور دشمن رویہ کی سختی سے مذمت کرتی ہے۔

پارٹی کے مزدور راہنماء محمد حسین بھٹی کی مکمل حمائت کا اعلان کیا۔ ورکرز پارٹی پاکستان ضلع خانیوال نے مہنگائی، لوڈ شیڈنگ، بیروزگاری اور کرپشن کی سخت مذمت کی اور ان کا ذمہ دار کرپٹ حکمرانوں کو قرار دیا۔

اجلاس میں مطالبہ کیا گیا کہ سامراجی قرضے ضبط کر لئے جائیں اور سامراج کے پنجوں سے ملک کو آزاد کروا کر کرپٹ حکمرانوں سے نجات حاصل کی جائے۔ اقتدار ملک کے حقیقی نمائندوں کے پاس ہونا چاہئے۔

اجلاس سے شفیع خان ٹانگرہ، خالد گل صاحب، ملک رفیق صاحب، ظفر اقبال بھٹی، خضر حیات چاون اور دوسرے مقررین نے اظہار خیال کیا۔ اجلاس کے آخر میں کنور بلال خان ایڈووکیٹ، ظفر اقبال چوہدری صوبائی سیکرٹری جنرل اور مرکزی راہنماء ظہور احمد خان نے خطاب کیا۔

نیوکاسل برطانیہ میں یوم مئی

رپورٹ: ملک محمد سلیم

یکم مئی 2011ء کونسل چیمبر گیٹ شیڈ سوک سینٹر نارتھ ایسٹ برطانیہ میں پہلی دفعہ یوم مئی کی تقریب منعقد ہوئی۔ مہمان خصوصی برطانیہ لیبر پارٹی کے مائیکل ہڈ تھے جو میئر بھی ہیں۔ یہ دن پاکستان آرٹ اینڈ کلچرل ٹرسٹ اور گیٹ شیڈ ایتھنک وزی بل گروپ کی کوشش سے منایا گیا۔ برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی کے مارٹن لیوی جو یونیورسٹی میں کیمسٹری کے اُستاد ہیں اور کالجز و یونیورسٹیز یونین کے صدر بھی ہیں۔ اُنہوں نے انگریزی میں یوم مئی کی عالمی اہمیت اور جدوجہد پر روشنی ڈالی۔ پیکٹ (P.ARTS.A.C.T.) کے صدر سید سجاد حسین شاہ نے یوم مئی کے حوالے سے موثر تقریر کی۔ کامریڈ رشید سرابھا نے اس عالمی دن کی سماج میں ہونے معاشی۔ سیاسی۔ اقتصادی اور ثقافتی تبدیلی پر روشنی ڈالی۔ آج کے دور میں آٹھ گھنٹے کام۔ آٹھ گھنٹے آرام۔ آٹھ گھنٹے دیگر مشاغل کے لئے ضروری ہے۔ مزدور دطبقہ سیاسی حکمرانی اپنے ہاتھ میں لے کر معاشی استحکام پیدا کرے۔ دنیا کے تمام محنت کشوں کے لئے باعزت جینے کے اسباب مہیا کرئے۔ اس کے لئے ہمیں سامراجیت کے عوام دشمن کردار اور فنانشل سرمایہ کی ہیت کو سمجھنا ہوگا۔ یوم مئی کے شہیدوں کو پنجابی۔ انگریزی۔ اردو زبان میں شاعری کے ذریعہ خراج تحسین پیش کیا گیا۔ شعراء اکرام جناب بابر مسعود۔ تارا سنگھ تارا۔ میاں یاور حسین۔ کامریڈ رشید سرابھا۔ ساجد حسین اور متحرمہ لبنیٰ کرن کے اپنا کلام منایا۔ موجودہ برطانوی حکومت کی ریاستی کٹوتیوں کی مذمت کی گئی۔ عراق۔ افغانستان۔ فلسطین۔ کشمیر۔ پاکستان۔ ایران اور دیگر ریاستوں پر سامراجیوں کی دہشت گردی کی مذمت کی گئی۔ جلسہ کے اختتام پر تمام حاضرین کی لذیذ پکوان اور چائے۔ کافی۔ سے خدمت کی گئی۔ اس جلسہ کی نظامت کے فرائض کامریڈ رشید سرابھا اور مسٹر اشوک کمار نے خوش اسلوبی سے نبھائے۔

یوم مئی

رشید سرابھا

سرقلم کئے ہمارے شب پرستوں نے
ہم تو اُجالے کی داستان لکھ رہے تھے لوگو

یکم مئی دنیا بھر کے محنت کشوں کا عالمی دن ہے۔ امریکہ کے مزدوروں نے اپنی انجمنوں کے ذریعہ اپنے اوقات کار میں کمی کے مطالبات کی جدوجہد 1834 میں شروع کی تھی۔ قومی طور پر منظم ریلوے یونین۔ ٹیکسٹائل یونین۔ تمباکو سگریٹ صنعت کی یونین اور دیگر محنت کشوں کی انجمن اور یونینوں نے ایک متحدہ پلیٹ فارم سے آٹھ گھنٹے کام۔ آٹھ گھنٹے آرام۔ آٹھ گھنٹے دیگر کاموں کے لئے مانگ کی۔ یہ مطالبہ ہڑتالوں۔ احتجاج۔ قربانیوں۔ جیلوں۔ پھانسیوں کے بعد پورا ہوا۔ محنت اور سرمایہ کے درمیان تضاد آج بھی جاری ہے۔ آج پوری دنیا کے محنت کش لیڈروں سوشلسٹ اور کمیونسٹ رہنماؤں کے جذبوں اور قربانیوں کا احترام کرتے ہوئے کہنا چاہوں گا۔ ہم یکم مئی کے شہیدوں اور اُن کے بعد تمام شہدا کو حقیقی طور پر خراج عقیدت اور اسطرح پیش کر سکتے ہیں کہ سامراجیت کے کردار کو سمجھیں۔ امریکی سامراج کی اقتصادی و معاشی استحصال کی پالیسی ہمارے سامنے ہے ریاستی دہشت گردی کا یہ عالمی چمپئن گذشتہ کئی سالوں سے عراق۔ افغانستان۔ فلسطین۔ کشمیر۔ ایران۔ پاکستان۔ لیبیا۔ افریقی اور لاء ایجنسی امریکہ کی اقوام پر خون کی ندیاں بہا رہا ہے۔ اپنی ملٹری قوت کیوجہ سے کرۂ ارض کو جہنم بنائے ہوئے ہے۔ پاکستانی عوام مہنگائی۔ دہشت گردی۔ توانائی کی قلت کا شکار ہیں۔ حکمران اپنے اقتدار کی خاطر دھرتی کو داؤ پر لگا چکے ہیں۔ عوام کو مایوسی کے اندھیرے میں قید کر کے خود امریکی سامراج کے سامنے جھک چکے ہیں۔ مذہبی جماعتیں امریکہ کی مخالفت، استحصال، لوٹ کھسوٹ اور اقتصادی بنیاد پر نہیں کر رہے ہیں بلکہ مذہبی بنیادوں پر کر رہے ہیں۔ ہماری ریاست نیم جاگیرداری، سرمایہ داری نظام میں پھنسی ہوئی ہے۔ صنعت کو بجلی، گیس، کی کمی نے تباہ کر دیا ہے زرعی زمین کو مزارعین، ہاریوں، چھوٹے مالک کاشت کاروں کے درمیان تقسیم کرنے سے انکاری ہے۔ پنجاب میں اوکاڑہ، خانیوال، مزارعین کے جائز مطالبات تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔ مزدور کسان اور دیگر مظلوم ومحروم طبقات پر مشتمل جدوجہد تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ تمام بائیں بازو اور جمہوریت کی داعی سیاسی جموعتوں کو اس سیاسی خلاء کو پر کرنے کا تاریخی کردار ادا کرنے کا فرض پورا کرنا ہے۔

بقیہ: اہتمام ضیائے سحر

ملٹی نیشنل سرمائے کی ریل پیل، جدید اسلحہ کی دوڑ اور گلوبلنگ کے دور میں ماضی کی کمزوریوں اور خامیوں کو دور کرنے کا شدت سے احساس رکھنا ہمارے لئے از حد ضروری ہے۔ ہمارے لئے آج بڑا امتحان ہے کہ ہم کیسے عوام دوست قوتوں کو یکجا کرنے، ظلم و جبر کے خلاف غیر مصالحانہ جدوجہد کرتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم سماجی تبدیلی کا طریقہ کار عوام تک لے جائیں اور متبادل قوت کے طور پر عوام کی تائید وحمایت حاصل کریں۔

☆☆☆☆☆

نیو کاسل میں فیض احمد فیض کی سو سالہ تقریبات

اردو کے عظیم شاعر فیض احمد فیض کی سو سالہ تقریبات کے سلسلے میں فیض سینٹینری نیشنل آرگنائزنگ کمیٹی نے پاکستان آرٹ اینڈ کلچرل ٹرسٹ نیو کاسل اور ساؤتھ ایشین پیپلز فورم کے باہمی اشتراک سے رنگارنگ تقریب گیٹ شیڈ کونسل چیمبرز میں منعقد کی۔ تقریب کی صدارت ممتاز براڈ کاسٹر فیض احمد فیض کے دوست رضا علی عابدی نے کی جبکہ مہمان خصوصی ترقی پسند رائٹر اور ٹریڈ یونینسٹ مارٹن لیوی تھے۔

تقریب سے خطاب کرتے ہوئے رضا علی عابدی نے فیض صاحب سے اپنی رفاقت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک سیاسی شعور رکھنے والے عظیم شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا موضوع دنیا بھر کے مظلوم و محکوم عوام تھے۔ وہ سامراجی استحصال اور غلبہ کے ہمیشہ خلاف تھے اور لڑتے رہے۔ انہوں نے کہا کہ فیض اس عہد کے شاعر تھے۔ ان کو لوگوں کے لئے بات کرنے اور ان تک اپنے جذبات پہنچانے کا سلیقہ آتا تھا۔ ان کو اردو عربی اور انگریزی پر عبور تھا۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنی نظموں کا انگریزی ترجمہ بھی خود کیا۔ انہوں نے کہا کہ فیض کے کلام کو عام لوگوں تک پہنچانے کی ضرورت ہے تا کہ لوگ اپنے کھوئے ہوئے حقوق کا حصول کر سکیں اور نامکمل آزادی کی تکمیل کر سکیں۔

ٹریڈ یونین رہنماء مارٹن لیوی نے فیض کو دنیا کا بڑا ترین شاعر گردانا اور کہا کہ عالمی امن ہو، افریقہ میں عوامی جدوجہد ہو، لاطینی امریکہ میں جدوجہد ہو یا پھر فلسطین میں، وہ ہمیشہ نہ صرف ان کے لئے لکھتے تھے بلکہ وہاں جا کر ان کے ساتھ رہتے اور ان کے حقوق کو جاننے کی کوشش کرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایک حادثہ نہیں ہے کہ ان کے قریبی ساتھی ناظم حکمت ترکی سے، محمود درویش فلسطین سے اور بہت سے دوسرے اس جدوجہد کا حصہ رہے۔

فیض سینٹینری کے راہنماء محسن ذوالفقار نے کہا کہ فیض آج بھی اتنا ہی ریلیونٹ ہے جتنا آج سے ساٹھ سال پہلے تھا۔ انہوں نے کہا کہ جب تک ظلم اور ناانصافی قائم ہے فیض کی شاعری کی اہمیت اسی طرح سے رہے گی جیسا کہ ہمیشہ سے ہر بحران کے دوران ابھر کر سامنے آتی ہے۔ انہوں نے فیض کی مشہور نظم ''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' ترنم کے ساتھ پڑھ کر سنائی۔

رشید سرابھا نے اس عزم کا اظہار کیا کہ فیض کے پیغام کو عوام تک پہنچانے کی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ انہوں نے فیض صاحب سے 1956 میں ہونے والی پہلی اور 1970ء میں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں منعقد ہونے والی بھاشانی کسان کانفرنس میں فیض کی شرکت و معاونت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ یاور حسین نے فیض کے بارے میں اپنی نظم سنائی اور ان کی جدوجہد کو خراج تحسین پیش کیا۔ کونسلر ماریہ ہال اور لوفل ایم پی ڈیوڈ اینڈرسن کی نمائندہ مسز لیز نے فیض کو بہت بڑا انسان دوست اور امن کا پیامبر گردانا۔ انہوں نے مستقبل میں ایسی تقریبات میں معاونت کا یقین دلایا۔

سلیم ملک اور صغیر احمد نے فیض صاحب کی زندگی اور جدوجہد پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور فیض صاحب کی نظموں کا حوالہ دیتے ہوئے انہیں بہت عظیم وطن دوست، امن پسند، جمہوریت پسند اور مظلوم و محکوم عوام کے حقوق کا علم بردار قرار دیا۔

اجلاس کے دوسرے حصے میں لبنیٰ کرن، چندہ نوید، نور اللہ، پروفیسر رضوانہ طارق، تارا سنگھ تارہ، یاور حسین، صغیر احمد، رشید سرابھا اور رضا علی عابدی نے فیض صاحب کی نظمیں ترنم کے ساتھ پڑھیں۔

☆☆☆☆☆

بریڈفورڈ میں فیض صدی کی تقریب

پروفیسر نذیر تبسم

برصغیر کے عظیم انقلابی شاعر فیض احمد فیض کی صد سالہ تقریبات کے سلسلہ میں ایک پر وقار تقریب بریڈفورڈ کے ثقافتی مرکز کلاسنگم کے ایڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ تقریب کا انعقاد فیض سینٹینری نیشنل آرگنائزنگ کمیٹی نے ساؤتھ ایشیاء کی ثقافتی تنظیم کلاسنگم اور ساؤتھ ایشین پیپلز فورم کے اشتراک سے کیا تھا۔ تقریب کے مہمان خصوصی پاکستان کے نامور کسان راہنماء فیض احمد فیض کے دیرینہ ساتھی چوہدری فتح محمد تھے۔ تقریب میں پاکستانی، انڈین، بنگلہ دیشی اور برٹش کمیونٹی نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی چوہدری فتح محمد نے فیض کی حب الوطنی اور اپنی مٹی سے محبت، ملک کو حقیقی عوامی جمہوری ریاست بنانے کے لئے جدوجہد اور ملک کے غریب مظلوم طبقے کو ریاست میں برابری کی بنیاد پر شریک کرنے کی جدوجہد پر زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ فیض سے اپنی رفاقت کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میری ان سے پہلی ملاقات 1950ء میں ہوئی جب فیض صاحب پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر تھے اور میں بھی اس کی مرکزی کمیٹی کا رکن منتخب ہوا تھا۔ 1970ء میں جب ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہم نے عظیم کسان کانفرنس منعقد کی جسے بھاشانی کانفرنس بھی کہتے ہیں۔ فیض صاحب نے ہماری بھرپور معاونت و راہنمائی کی۔ انہوں نے کہا کہ میری آخری ملاقات 1978ء میں ماسکو میں ہوئی جب میں پاکستانی وفد کے ساتھ تاشقند میں ہونے والی اقوام متحدہ کی فوڈ اینڈ ایگریکلچرل آرگنائزیشن کی کانفرنس میں گیا تھا۔ اس سے قبل ایوب خان کا مارشل لاء لگا تو فیض صاحب اور ہم سب اکٹھے لاہور جیل میں بھی نظر بند رہے۔ انہوں نے کہا کہ فیض اپنے عوام کے لئے امن، خوشحالی اور بہتر مستقبل کے لئے ہمیشہ جدوجہد کرتے رہے۔ وہ بالادست طبقات کے تسلط کے خلاف اور ملک میں 64 برس سے جاری لوٹ گھسوٹ، غربت، جہالت، بے روزگاری اور علاج معالجے کے فقدان کے خلاف برسرپیکار رہے۔ وہ نوجوان نسل کی اعلیٰ اور معیاری تعلیم کی فراہمی کیلئے جہاد کرتے رہے جبکہ مذہبی انتہاء پسندی و فرقہ پرستی کے جہاد سے اپنے ہی نہتے عوام کا خون بہ رہا ہے۔

تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ساؤتھ ایشین پیپلز فورم کے راہنماء پروفیسر نذیر تبسم نے ترقی پسندی اور ترقی پسند تحریک کے آغاز، انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس وقت بھی عالمی کساد بازاری نے عوام کو نچوڑ سے اور آج بھی ویسے ہی حالات ہیں۔ سرمایہ داری نظام ڈگمگا رہا ہے۔ نجی ملکیت کا نظام سرکاری امدادوں پر چل رہا ہے۔ ماسوائے اسلحہ سازی تمام صنعتیں بند ہو رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سامراج جنگوں کے جنون میں مبتلاء ہے تا کہ اپنے ملک کے عوام کو روزگار فراہم کر سکے اور اپنی عالمی لوٹ گھسوٹ قائم رکھ سکے۔

اردو کے نامور شاعر ڈاکٹر مختار الدین احمد مختار نے فیض احمد فیض کو انسانی حقوق کا عظیم علم بردار اور عالمی امن کا داعی قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ فیض کے نظریے اور عمل میں مطابقت تھی اور ساری زندگی اس پر کاربند رہے۔ انہوں نے امن کے بارے میں فیض کی نظموں سے اشعار بھی پڑھے اور دنیا بھر میں امن کے لئے ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔

پنجابی کے مشہور شاعر ممتاز اعوان اور نوجوان شاعرہ تسنیم حسن نے فیض کی جدوجہد پر لکھے اپنے تازہ کلام سنائے اور داد وصول کی۔

نوجوان گلوکار ڈاکٹر اشفاق اے خان نے موسیقار موسیٰ بھائی کی دھنوں پر فیض احمد فیض کا کلام گایا خصوصاً مجھ سے پہلی سی محبت، گلوں میں رنگ بھرے اور ہم دیکھیں گے بہت خوبصورت انداز میں گائے۔

اس سے قبل خالد سعید قریشی اور ڈاکٹر گیتا نے پروگرام کی تفصیل و مہمان خصوصی کا تعارف کرایا اور ان کی 62 سالہ جدوجہد پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے کلاسنگم، فیض سینٹینری نیشنل آرگنائزنگ کمیٹی اور ساؤتھ ایشین پیپلز فورم کے اشتراک عمل کو ساؤتھ ایشین تہذیب وثقافت کی ترویج وترقی کے لئے اہم قرار دیا۔

تقریب کے اختتام پر فیض سینٹینری بریڈفورڈ کمیٹی کے کنوینر لالہ محمد یونس نے تمام حاضرین اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

☆☆☆☆☆

آؤ کہ اہتمام ضیائے سحر کریں

غلام دستگیر محبوب

بائیں بازو کے تمام دوست اس بات پر متفق ہیں کہ موجودہ گلے سڑے نظام کو بدلنا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ مگر یہ سماجی تبدیلی کیونکر ممکن ہو سکے گی۔ سماجی تبدیلی کے دعویدار تمام گروپ اور پارٹیاں اعلیٰ مقاصد حاصل کرنے کے علمبردار ہوتے ہوئے بھی دست و گریبان رہی ہیں۔ اور کچھ تو حکمران سیاسی پارٹیوں کی آلہ کار بھی بنتی نظر آئی ہیں۔ تعمیر اور تخریب کا یہ کھیل وطن عزیز میں کئی دہائیوں تک جاری و ساری رہا ہے۔ بحیثیت مجموعی ایک لمبے عرصے تک تمام توانائیاں صرف کرنے کے باوجود منزل تک نہیں پہنچ سکے۔

موجودہ حالات اس لحاظ سے خوش آئند ہیں کہ درست سمت میں سفر کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ انتشار کی کیفیت تبدیل ہو کر اتحاد کی طرف گامزن نظر آتی ہے۔ سامراج اور اس کی پالتو اسٹیبلشمنٹ کے خلاف عوام میں ایک شعوری تبدیلی کارفرما نظر آ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنجیدہ سیاسی عناصر اور پارٹیاں عوام دشمن حکمران گروہوں اور پارٹیوں سے نجات حاصل کرنے، موجودہ صورت حال کو تبدیل کرنے اور ایک متبادل سیاسی پلیٹ فارم / پارٹی بنانے کے عمل میں شریک ہو رہے ہیں۔ یہ صرف آغاز ہے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ عوام کے وسیع تر حلقوں کی نظر میں حکمرانوں کی بھول بھلیوں کی سیاست اور استحصالی نظام کو بچانے کی تمام کوششیں بے نقاب ہوئی ہیں۔ بیرونی اور مقامی دہشت گردوں نے عوام کا جینا حرام کر دیا ہے۔ ریاست اپنے بنیادی فرائض پورا کرنے میں بری طرح ناکام نظر آتی ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ نفاق پیدا کرنے والے تمام عوامل اور کرداروں پر کڑی نگاہ رکھی جائے۔

منزل کے حصول کی جانب اس سفر اور جہد مسلسل میں سیاسی کارکنوں اور اکابرین کی ایک خاطر خواہ تعداد سنجیدہ اور committed ہے۔ تاہم ماضی کے عارضوں سے مکمل نجات حاصل کرنا بھی ایک کٹھن کام ہے۔ ورکنگ کلاس اور غریب عوام کو درپیش روزمرہ زندگی کی مشکلات، ظلم و جبر اور زیادتیوں سے چھٹکارا دلانے کی جدوجہد کرنا اشد ضروری ہے۔ پارٹی منظم کرنے کے لئے نوجوانوں کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ جن محاذوں پر ہمیں آگے بڑھنا ہے یا جو کام فوری کرنے کے ہیں ان میں:

(۱) پارٹی کو ''کاڈر'' کے دائرہ تک محدود رکھنے کی بجائے عوام کو مسائل سے جڑت کا راستہ اختیار کرنا۔

(۲) تحریک میں توسیع کے اٹکے ہوئے کام کو پورے شدومد سے جاری کرنا۔

(۳) عوامی مسائل پر ایجی ٹیشن کا محاذ ہر حال میں گرم رکھنا۔

(۴) پارٹی کے اندر تمام فورموں پر مکالمے کے رجحان کو تقویت دینا۔

(۵) پرانے گروہی رجحانات کی روش کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا۔

(۶) پارٹی تنظیم کو فعال بنانے میں حائل ''پسند اور ناپسند'' کی روش مکمل ترک کرنا ہے۔

محنت کش طبقہ اور اس کے سائنسی نظریات سے گہری وابستگی استوار رکھنا ماضی کا ہمارا شاندار اثاثہ ہے اسے مزید طاقتور بنانا، خامیوں کو خوبیوں میں تبدیل کرنا، وسائل کی کمی کو پورا کرنا اور خصوصی طور پر نوجوان نسل سے گہرا رشتہ استوار کر کے انہیں ہم رکاب رکھنا ہے۔

مزدور طبقے کا نظریہ اور فلسفہ حیات ایک سائنسی حقیقت ہے جو کوئی جامد شے نہ ہے بلکہ مسلسل ارتقاء پذیر ہے۔ دنیا بھر کے ذہین فطین اکابرین اور راہنماؤں نے اس نظریہ کو عصر حاضر کی سائنسی حقیقت کے روپ میں ڈھالنے کا کردار ادا کیا ہے۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ نہ صرف ہم موجودہ دور کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوں بلکہ موجودہ بدترین سماجی حالات کو تبدیل کرنے کا ہنر بھی رکھتے ہوں۔

باقی صفحہ نمبر 18 پر

بریڈفورڈ (یوکے) میں منعقدہ تقریب کی تصویری جھلکیاں

CPL NO. 279

MONTHLY AWAMI JAMHURIAT
July, 2011
LAHORE

کچھ بول میرِ کارواں

ارشاد جالندھری

جب لٹ رہا ہو گلستاں، جب جل رہے ہوں آشیاں
جب گر رہی ہوں، بجلیاں، جب ہو فضاؤں میں دھواں
جب شہر ہوں آتش فشاں، جب راکھ ہو جائیں مکاں
پھر وہ کہیں جائیں کہاں، کچھ بول میرِ کارواں
ہم ہو رہے ہیں بدگماں

کیا خوب ہے یہ رہبری، بے رہ روی کچھ خود سری
ہر وقت کنبہ پروری، صد حیف ایسی لیڈری
ذہنوں کی یوں سوداگری، اک دوسرے پر برتری
کیوں بک رہے ہیں پاسباں، کچھ بول میرِ کارواں
ہم ہو رہے ہیں بدگماں

مفلوج جب قانون ہو، کیوں حرمتِ خاتون ہو
فرعون ہو قارون ہو، آزاد ہر ملعون ہو
انصاف جب مرہون ہو، پھر کیوں نہ ہر سو خون ہو
ہے ذرہ ذرہ خونچکاں، کچھ بول میرِ کارواں
ہم ہو رہے ہیں بدگماں

سنسان ہر بازار ہے، اور بند کاروبار ہے
بارود کی بھرمار ہے، خطرات کی یلغار ہے
کس سوچ میں سرکار ہے، کیا یہ کوئی تہوار ہے
یہ ہو رہا ہے کیا یہاں، کچھ بول میرِ کارواں
ہم ہو رہے ہیں بدگماں

جب زندگی درگور ہو، آدم ہی آدم خور ہو
ظالم کی لمبی ڈور ہو، عیاشیوں کا زور ہو
انصاف کا بھی شور ہو، خود پاسباں جب چور ہو
پھولے پھلے کیوں گلستاں، کچھ بول میرِ کارواں
ہم ہو رہے ہیں بدگماں

سچائیاں معدوم ہوں، حالات بھی مسموم ہوں
بیزار جب محکوم ہوں، جب مستحق محروم ہوں
مایوس جب مظلوم ہوں، اور قتل جب معصوم ہوں
پھر ہو خدا کیوں مہرباں، کچھ بول میرِ کارواں
ہم ہو رہے ہیں بدگماں

تقریر تو پُر جوش ہے، لیکن تُو خود کم کوش ہے
بدقسمتی بردوش ہے، اس پر بھی تو مدہوش ہے
مجرم ہے جو روپوش ہے، تو کس لئے خاموش ہے
کیا ہیں تیری مجبوریاں، کچھ بول میرِ کارواں
ہم ہو رہے ہیں بدگماں

ہر سمت قتلِ عام ہو، ہر شہر میں کہرام ہو
جب گردشِ ایام ہو، تدبیر بھی ناکام ہو
جب اپنے سر الزام ہو، اور نام بھی بدنام ہو
کس کام کی یہ کرسیاں، کچھ بول میرِ کارواں
ہم ہو رہے ہیں بدگماں

اجلاس ہوں جب مشغلے، آسان ہوں کیوں مرحلے
جب ہوں غلط سب فیصلے، کیوں گردشِ دوراں ٹلے
جب آگ کی آندھی چلے، اور ہوں بدن پر آبلے
ڈھونڈیں مسیحا کو کہاں، کچھ بول میرِ کارواں
ہم ہو رہے ہیں بدگماں

یہ قوم تو کنگال ہے، اور پھر بھی استحصال ہے
ہر بات میں اک چال ہے، مکر و ریا کا جال ہے
وعدہ تمہاری ڈھال ہے، رہبر کا جب یہ حال ہے
منزل نہ ہو کیوں بے نشاں، کچھ بول میرِ کارواں
ہم ہو رہے ہیں بدگماں

کیوں سرخ ہے یہ رہگزر، لاشے پڑے ہیں خاک پر
یہ ہے پسر وہ ہے پدر، ڈوبے ہیں خوں میں سر بسر
چھلنی ہوا کس کا جگر، پتھرا گئی کس کی نظر
دیکھا ہے تو نے یہ سماں، کچھ بول میرِ کارواں
ہم ہو رہے ہیں بدگماں

ماحول جب سفاک ہو، جب خون ہی پوشاک ہو
ماں کا کلیجہ چاک ہو، اور ہر بہن غمناک ہو
بیٹی کے سر میں خاک ہو، رخ جانبِ افلاک ہو
بیوہ کہے جب الاماں، کچھ بول میرِ کارواں
ہم ہو رہے ہیں بدگماں

یہ کون سی رُت آئی ہے، جو ہر کلی مرجھائی ہے
ہر کام میں پسپائی ہے، مہنگائی ہی مہنگائی ہے
یہ کون سی دانائی ہے، جو باعثِ رسوائی ہے
یہ کون سی ہیں خوبیاں، کچھ بول میرِ کارواں
ہم ہو رہے ہیں بدگماں

افسردگی ہے یاس ہے، اب تک نہ کوئی آس ہے
بس بھوک ہے افلاس ہے، ماحول بھی کب راس ہے
ہر دم یہی احساس ہے، یہ دیس بھی بن باس ہے
کب تک یہ ہوگا امتحاں، کچھ بول میرِ کارواں
ہم ہو رہے ہیں بدگماں

یہ حال ہو جب سُو بسُو، ہر سمت بکھرا ہو لہو
پامال ہو جب آرزو، ہوں عصمتیں بے آبرو
محشر بپا ہو چار سُو، جب امن کی ہو جستجو
ارشاد کیوں چپ ہو زباں، کچھ بول میرِ کارواں
ہم ہو رہے ہیں بدگماں